(جملہ حقوق محفوظ)

خیالستان

مختصر افسانوں کا مجموعہ

مصنفہ

سید سجاد حیدر صاحب بی اے

سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

برائے

شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ

لاہور

[illegible] پرنٹر کریمی پریس لاہور طبع ہوا) قیمت فی جلد [illegible]

([illegible])

خیالستان

(مختصر افسانوں کا مجموعہ)

مُصنّفہٗ

سیّد سجاد حیدر صاحب بی۔ اے

(یلدرم)

ڈیڈیکیشن

اپنے دو عزیز دوستوں

یعنی

نواب صدر یار جنگ بہادر جناب حبیب الرحمٰن خاں صاحب حسرت شروانی رئیس حبیب گنج

صدر الصدور امور مذہبی حضور نظام

اور

میر نیرنگ بی اے وکیل انبالہ

کے نام

جن کی مبالغہ آمیز ستائشوں نے ان قصّوں کے لکھنے یا تلخیص کرنے کی ہمّت دلائی

ہیں

بغیر اُن کی اجازت کے ان اوراق کو

معنون کرتا ہوں

سجّاد حیدر

نوٹ

یہ فسانے کچھ طبعزاد ہیں، کچھ ترکی و انگریزی سے ملخص

خارستان و گلستان صحبتِ ناجنس نکاحِ ثانی سودائے سنگیں	ترکی سے لئے گئے ہیں مگر ان میں میں نے بہت کچھ تصرف کیا ہے۔
مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ	انگریزی کے ایک مضمون کا چربہ ہے۔
ازدواجِ محبت چڑیا چڑے کی کہانی حضرت دل کی سوانح عمری حکایۂ لیلیٰ و مجنوں غربت و وطن (وغیرہ وغیرہ)	میرے ہی ناکارہ تخیل کا نتیجہ ہیں۔

سجاد حیدر

فہرست مضامین خیالستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خیالستان

تمہید

اِن چند سطروں کے لکھنے کا مقصد، نہ تقریظ ہے نہ تنقید،
بلکہ اس کا مطلب ہے محض ایک تمہید۔

آج اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ناظرین سے سیّد سجّاد حیدر صاحب کی تقریب کی جائے۔ سیّد صاحب موصوف کا نام دلدادگانِ فنِ ادب کے لئے نیا نام نہیں ہے۔
میرا مطلب صرف اِس قدر ہے کہ اس مجموعے کے مدعائے اشاعت کے متعلق چند ضروری باتیں درج کر دوں۔

یہ تحریریں مختلف موقعوں پر مختلف رسالوں میں زیادہ تر

مخزن میں) شائع ہو کر قبولِ عام کا (شاید یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ قبولِ خاص کا) تمغہ حاصل کر چکی ہیں۔ سیّد صاحب میرے حال پر خاص التفات فرماتے ہیں۔ اس اختصاص کی وجہ سے میں نے اصرار کیا کہ ان تحریروں کا رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہونا (اور وہ بھی بسا اوقات بہ اقساط) ان کے لئے کافی انصاف نہیں ہے۔ میں نے کئی دفعہ یہ گزارش کیا کہ ان تحریروں کو ایک مجموعے کی شکل دی جائے تاکہ خیالات کی ان بولتی چالتی تصویروں کا ایک مرقع مرتب ہو جائے اور "حکایۂ لیلیٰ و مجنوں" جیسے دلچسپ مضامین ناظرین تک دست بُرید(ہ) حالت میں نہ پہنچیں۔

میں خوش ہوں کہ میرے متواتر تقاضے نے آخر اثر کیا اور سیّد صاحب نے یہ مجموعہ چھپوا دیا۔

اس گئے گزرے زمانے میں بھی اُردو فنِ ادب کے خیر اندیشوں اور خادموں کی تعداد (بحمد اللہ) معقول ہے اور جس کسی کو بھی اس معاملے سے کچھ دلچسپی ہے۔ وہ یہ دیکھ کر

ضرور خوش ہوگا کہ طرزِ خیال اور اندازِ بیان کی توسیع کی کوششیں مختلف سمتوں میں علیٰ قدرِ مراتب ہو رہی ہیں۔ میں پُرانے رنگ کا قدر ناشناس نہیں ہوں۔ لیکن اُن لوگوں میں ضرور ہوں جو یہ چاہتے ہیں کہ نئے نئے طرزِ خیال، نئے اندازِ بیان ایجاد ہوں۔ جدت کو بدعت (اور وہ بھی بدعتِ سیئہ) نہ سمجھا جائے۔ فطری جذبات جن کی اصلیت سے عامۂ شعراء و مصنفین بسا اوقات دُور جا پڑتے ہیں۔ نظم و نثر میں سچائی کے ساتھ ظاہر ہوں لفظی ٹیپ ٹاپ کو بجائے خود مدعا نہ بنا لیا جائے۔ الغرض حسنِ بیان نہ صرف قائم ہی رہے بلکہ ترقی کرے۔ اس ترقی میں رنگا رنگی اور تنوع کو شامل سمجھا جائے۔ اور ساتھ ہی حسنِ خیال کو حسنِ بیان کی جان قرار دیا جائے۔

ان کوششوں میں سید سجاد حیدر بھی شریک ہوئے ہیں۔ شاہدِ رعنائے سخن کے شیدائیوں میں وہ کسی سے پیچھے نہیں آگے ہی ہیں لیکن وہ عاشق بھی ہیں اور مشاطہ بھی۔ وہ اسباب حسن یار کے بڑھانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے

ہیں؟ اس کا جواب اُن حضرات سے پوچھیے جو اہلِ نظر اور صاحب طبیعت ہیں۔ اُن کے اندازِ بیان میں کہیں کہیں تو انگریزیت کی جھلک ہے اور کہیں کہیں غالباً ترکی طرزِ بیان کا چربہ ہے مگر داد کے قابل یہ بات ہے کہ انگریزی اور ترکی کی یہ تقلید عملی طور پر ایجاد کا حکم رکھتی ہے۔ کیوں کہ وہ غیر مانوس اور ناخوشگوار نہیں ہونے پاتی۔ اس میں انوکھا پن ہوتا ہے مگر اجنبیت نہیں ہوتی۔

علاوہ اس کے ان تحریروں میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ وہ صرف پُر معنی ہی نہیں بلکہ معنی خیز ہیں۔ صرف معنی خیز ہی نہیں بلکہ خیال انگیز ہیں۔ گویا یہ خیالات ہی نہیں ہیں بلکہ خیالات کے تخم بھی ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس لحاظ سے "خیالستان" ناموزوں نام نہیں ہے۔ یہ نام میں نے ہی تجویز کیا تھا اور میں خوش ہوں کہ یہ خیالستان "خیالستان" ہی کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

نیرنگ

دیباچہ

زبان قاری یا سامع کے ذہن کو دو طرح متاثر کرتی ہے۔ ایک تو حروفِ الفاظ کے ذریعے ذہن میں ایک معنی خاص منتقل کرتی ہے۔ دوسرے اصواتِ الفاظ کی امداد سے غیر محدود خیالات کی محرک ہوتی ہے۔ جہاں تک سامع کے علم کو دخل ہے، مدلولاتِ الفاظ سے صرف ایک معنی خاص مفہوم ہوتے ہیں۔ مگر التزاماً مدلولاتِ الفاظ کے متعلق بہتیری دوسری صفات کا علم بھی حاصل ہوتا ہے۔ جب زبان کے یہ دونوں اثر یعنی معنیٰ اصلی اور لوازم و متعلقات یا ادراکِ مطلب و احساسِ کیفیت ایسی مساوی قوت سے عمل کرتے ہوں کہ قاری یا سامع کے ذہن پر بجائے اس کے دو جداگانہ اثر پڑیں، دونوں مدغم و منضم ہو کر اثر واحد کا حکم رکھتے ہوں تو ایسی زبان بلحاظ فصاحت ایک "اندازِ خاص" رکھتی

ہے۔ لیکن اگر صرف حروفِ الفاظ کے ذریعے ذہن میں ایک معنی خاص مفہوم ہوتے ہوں۔ لیکن بذریعہ تجنیس یا نغمۂ اصوات اس معنی خاص کو ذہن نشین یا زیادہ واضح کرنے کے لئے کوئی مدد نہ پہنچے، تو وہ اسلوب "انداز" سے معرا رہے گا۔ ایسی صورت میں زبان سے مخاطب کے ذہن پر ایک ایسا اثر واقع ہوگا جو واحد نہیں بلکہ دو جدا جدا اثر ہیں۔

خیابستان کے تمام مضامین "انداز" کے مندرجہ بالا اوصاف سے مالامال ہیں۔ مثلاً "سودائے سنگیں" کے اس فقرے میں کہ "اہرمن اپنے لمبے ہاتھوں کے لمبے ناخن بڑھا بڑھا کے گاڑ گاڑ کے سینۂ ظلمت کو پھاڑ رہا تھا" جہاں الفاظ کے معانی سے ایک خاص مفہوم دماغ کو معلوم ہوتا ہے۔ وہاں محض "ڑ" اور "ل" کی اصوات سے بھی معانی کو ایک ایسی مدد ملتی ہے کہ برسات کی بادلوں والی رات کی کیفیات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

یا مثلاً اس فقرے کی جگہ کہ "رات کی تاریکی میں لرزتی لرزتی اپنے کمرہ کو لڑھکاتی لڑھکاتی اور آتے وقت قدمیں بڑھتی بڑھتی

آتی ہے۔" اگر سیّد صاحب لکھتے کہ "رات کی سیاہی ہیں کانپتی اپنے کرہ کو دھکیلتی اور آگے آتے وقت قدیں لمبی ہوتی ہوئی آتی ہے۔" تو گو معانی ہیں تو کوئی فرق نہ پڑتا، لیکن اصوات الفاظ سے جو فقرے ہیں ایک وحشت کی تھرتھری پیدا ہو گئی ہے وہ بالکل مفقود ہو جاتی۔

سیّد سجّاد حیدر صاحب ہر جگہ موقعے کے مناسب الفاظ استعمال کرنے ہیں بہت محتاط رہتے ہیں۔ کہیں وہ ایسے الفاظ تلاش کر کے لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں کہ جن کی اصوات ان کے معنوں کا سراغ دیتی ہیں۔ کہیں آپ صرف ایک موزوں لفظ یا نفیس و نازک ترکیب سے فقرے ہیں زندگی کی لہر پیدا کر دیتے ہیں اور بعض اوقات ان کے الفاظ ائتلاف کا ذہنی عمل بیدار کر کے پڑھنے والے کے معمولی تجربات و مشاہدات کو ایک عجیب دلکش روشنی ہیں پیش کرتے ہیں۔ خیالستان کا ہر صفحہ اس قسم کی مثالوں سے پُر ہے جن ہیں سے چند ہم ذیل ہیں درج کرتے ہیں:-

۱- تیر ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اس کی طرف گیا۔

۲- اِدھر سلسبیلِ قمر اس کے بدن پر پڑ رہی تھی۔

۳- بڈھا رواں بادلوں پر نظر گاڑ کر سوال کا جواب دیتا۔

۴- یہ صرصرِ رنگ وسحاب سمندر کے کنارے رُک گئی۔

۵- اس آواز میں ایک عزم آہنیں کی قوت - ایک حکم عدالت کی مہابت موجود تھی۔

۶- اس کے دل میں ایک طغیانِ غرور اُٹھا۔

۷- جس کی ہیئت کذائی سے بوئے فحش کے بھپکے نکل رہے تھے۔

۸- دو آنسو کے قطرے، دو قطرۂ سعادت ڈھلک رہے تھے۔

۹- ان سب چیزوں کو لرزشِ حیات دینے والی موم بتّی تھی جس سے مختصر سی روشنی نکل رہی تھی۔

۱۰- وہ شفقت ورقت، رُوحانیت وانسانیت کی دیوی ماں۔

صوت ومعنیٰ کا کامل اتحاد اس قدر الفاظ پر منحصر نہیں جس قدر ان کی ترتیب پر موقوف ہے۔ فن تحریر میں دیگر فنون کی طرح سب سے پہلا کام الفاظ کا انتخاب ہے۔ اور اس کے بعد ایک نمونہ خاص کے مطابق ان کی ترتیب۔ چنانچہ اس باب میں "نمونہ" کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔

تحریر کے سحر کے متعلق مشہور انگریزی مصنف آر ایل سٹیونسن نے نہایت دلچسپ بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہر جملے میں بجز اس کے کہ وہ

PATTERN. ؎

بہت ہی مختصر ہو۔ ایک قسم کا عقدہ یا گرہ ہوتی ہے۔ ایک حد خاص تک مطلب
میں بتدریج تعقید یا ایک طرح کا اجمال بڑھتا جاتا ہے اور اس کے بعد حل
یعنی تفصیل کا درجہ آتا ہے۔ فن کلام کا اقتضا یہ ہے کہ اس طبعی اجمال و تفصیل
یا حل و عقد خیالات کے مقابلے میں الفاظ جملہ میں بھی اسی قسم کا حل و عقد بالمقابل
پایا جائے۔ جب تک خیالات کے عقدے کے مقابل میں الفاظ میں بھی تعقید
نہ ہوگی، کلام کے دو جداگانہ اثر جو عقل و سماعت پر ہونے چاہئیں تھے،
بجائے مجموعی واحد اثر پیدا کرنے کے ایک دوسرے کے مخالف اثر پیدا
کرینگے۔ لہذا کلام کے تار و پود میں معانی، الفاظ اور اصوات الفاظ کا
ایک انداز خاص میں ہونا ضروری ہے۔ کلام کا وہ اثر ہی جو سامع سے
تعلق رکھتا ہے فصاحت کی بنیاد ہے اور خوبی کلام بہ نسبت کسی اور چیز کے
زیادہ تر اسی پر موقوف ہے۔ اس باب میں مصنف کو نظم کی نسبت نثر
میں زیادہ آزادی اور سہولت رہتی ہے۔ نظم کا نمونہ زیادہ مشکل ہوتا ہے۔
نثر میں ایک انداز خاص سامع کے مطابق بنا دینا چنداں مشکل نہیں۔
اس کے بعد صرف اتنا کام باقی رہ جاتا ہے کہ مصنف پُر لطف تنوع سے
کام لے کر تکرار و اعادہ الفاظ سے حتی الامکان گریز کرے۔

اُردو مصنّفین میں اثر کی ان باریکیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور بہت کم مصنفین کا کلام اس قسم کی تنقید کا متحمل ہو سکتا ہے۔ مگر سیّد صاحب کے کلام میں انداز کی یہ خصوصیات اکثر موقعوں پر موجود ہیں۔ ان کے فقروں کی موسیقی مطالب و معانی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور سامع کے کانوں کو کہیں کسی قسم کی غیر متوقع مایُوسی یا بے آہنگی محسوس نہیں ہوتی۔

خیالستان نہ صرف انداز کے محاسن گوناگوں ہی سے مرصع ہے، بلکہ لطیف جذبات، نازک شاعرانہ خیالات اور ظرافت کے شگفتہ مضامین کا ایک بے نظیر مجموعہ ہے اور مصنف نے ہر موضوع کے مطابق مختلف مضامین میں اتنا موزوں طرز بیان اختیار کیا ہے جس پر تفصیلی تنقید ایک کتاب کی ضخامت کی محتاج ہے۔

اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ خیالستان پہلی کتاب تھی جس کی اشاعت نے ادب اُردو میں ایک نہایت حسین، دلکش "انداز" پیدا کر دیا اور ادب کی وسعت کے لئے نئے نئے راستے کھول دیئے +

سیّد امتیاز علی تاج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خیالستان

خارستان و گلستان

(۱)

گُلستان

آج سے دس ہزار برس قبل کا ماجرا ہے۔ بحرِ ہند میں ایک جزیرہ تھا جو اب ناپید ہے۔ چاندنی رات تھی، سطحِ آب پر سکونِ مطلق طاری تھا اور اس سکون پر چاند اپنی شعاعیں ڈال رہا تھا۔ فضا میں خاموشی، بے پایاں سمندر، ڈراونی تنہائی، وحشت انگیز سکوت کوئی صدا نہیں، کوئی اثرِ حیات نہیں۔ ایک غیر محدود مگر روشن

تنہائی، ایک محشرِ سکون! یہ عالم ہے۔ چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے، موجیں بھی سوچ رہی ہیں، چاند کی کرنوں کے سیلان سے بچا ہوا سایہ سوچ رہا ہے، بادلوں کے منتشر ٹکڑے سوچ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا، اس خاموشی کا بھید چپکے چپکے سمندر کے کان میں کہنا چاہتی ہے اور نہیں کہہ سکتی، سمندر کا سینہ سانس لینے کی کوشش کرنا چاہتا ہے، تمام موجودات میں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے پایاں سُستی اور سکوت میں اگر کہیں سے ذرا سی صدا بھی آجائے تو دُنیا ہنس پڑے گی، اُچھل پڑے گی۔

نسرین نوش جزیرے کے دامن میں، سمندر کے ریت پر ایک سروِ زریں کی طرح جو زمین پر گر پڑا ہو لیٹی ہوئی تھی کہ موجوں میں کچھ حرکت پیدا ہوئی، اور وہ نسرین نوش کے عریاں جسم، چاند جیسے عریاں جسم پر، گردن پر، بالوں میں سے گزرنے لگیں ادھر سلسبیلِ قمر اُس کے بدن پر پڑ رہی تھی، اُدھر چھوٹی چھوٹی موجیں ایک دوسرے کو ہٹاتی آتی تھیں اور اُس سیمیں

تن کے کبھی بالوں میں سے گزرتی تھیں، کبھی اس کے گورے بازوؤں سے لپٹتی تھیں، کبھی اُس کے بلوری سینہ سے ملابست کرتی تھیں، کبھی اُس کے ارغوانی پاؤں کو سہلاتی تھیں، اور اور اس کے بوسے لے لے کر آگے چلی جاتی تھیں، اور پھر لوٹ کر آتی تھیں اور قعرِ بحر سے موتی لا لا کر اس کے پاؤں پر نثار کر کے نہایت تعظیم اور احترام کے ساتھ واپس جاتی تھیں۔

نسرین نوش ایک پُر لطف تھکن سے، ایک بیہوش نشے سے آہستہ آہستہ بیدار ہوئی، اس کے چاروں طرف جو پریاں ایک ہالہ بنائے کھڑی تھیں، اُن پر نظر ڈالی، اور اپنے لعل لبوں سے برق تبسم گرا کے کہا: "میری پیٹھ ملو" اس پر چند خدامہ تعمیل حکم میں مصروف ہوئیں، اور اس کے بعد چند اور پریاں جو ریشمی تولیا، چادر وغیرہ لئے کھڑی تھیں، انہوں نے اُس کے بازوؤں، سینے، اور پاؤں کو پونچھنا اور بالوں کو سکھانا شروع کیا۔ نسرین نوش اس شاہراہ زریں کو جو چاند نے اس تک بنا رکھی تھی، دیکھنے اور موجوں کی ارگن کو سُننے لگی۔

اتنے میں ایک قسم کی چھوٹی پریاں، صدف بحر کی بنی ہوئی نفیریاں اور دف اور سارنگی اور ستار غرض کہ پورا ساز لئے ہوئے نسرین نوش کے گرد اڑنے اور ستارہ بجانے لگیں، نسرین نوش اُٹھ کھڑی ہوئی اور ماہتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کے، اس رات کے لئے اسے "خدا حافظ" کہا اور اپنی سہیلیوں کے کبھی کندھوں پر ہاتھ رکھ کے، کبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے، پھولوں سے چھپے ہوئے راستے پر نسیم کی طرح خرام ناز سے چلنا شروع کیا۔

اس وقت پھُول جھُک جھک کے سلام کرتے تھے، اور ایک دوسرے سے مل کر گویا تالیاں بجاتے، بنفشہ اُس کے پاؤں چُومنے اور روندے جانے کی تمنّا سے راستہ میں آپڑتا تھا، نسرین نوش پانچ منٹ تک چلی ہوگی کہ ایک کاشانۂ بلّور میں داخل ہوئی۔

چاند کا عکس اس محل کی گل دیواروں، اور صحن کے فوّارے پر پڑتا تھا، اور اس فوّارۂ نور سے ایک زمزمۂ روح نواز پیدا ہو رہا تھا۔ حوض کے کنارے نیبو، نارنگی، ترنج کے پودے پھُولوں سے

لدے ہوئے دماغ کو فرحت دے رہے تھے، یہ سب ایک دسترخوان پر بیٹھ گئیں، زبرجد کے طباقوں میں طرح طرح کے کھانے اور میوے لائے گئے، خرمے، انار، انگور، سیب، شکار کے گوشت، مچھلیاں لائی گئیں، لالے کے پیالوں میں شراب، شربت، گلاب پئے گئے۔

حوض کے دوسری طرف، ناچنے والیوں، گانے والیوں نے ایک حلقہ باندھا، اور رباب، مزمار، بربط، ستار پر نسرین نوش کی حُسن اورادا کی تعریف میں قصیدے، غزلیں، ٹھمریاں گانی شروع کیں گانا بھی وہ گانا جو ایک جوئے رواں کی طرح مسلسل تھا۔

ادھر سہیلیوں نے چھیڑ خانی شروع کی، رفتہ رفتہ لالوں، اور پھولوں کو پھینک کے لڑائی شروع ہوئی، اور تھوڑی دیر میں پھولوں سے زخم کھا کھا کے پریاں گرنے لگیں۔

لذیذ شراب کے نشہ سے، نسرین نوش ہنستی ہوئی ایک سہیلی کی گود میں گر پڑی، اور اپنے ہونٹ چُوس چُوس کر نظر اس طرح دُور دُور ڈالنے لگی۔ گویا عالم خیال میں ہے، سہیلیاں، اپنی مالکہ کے ہاتھ چُوم چُوم کے، اُس کی بالوں کی خوشبو سے دماغ معطر کر کرکے

شراب کا ایک ایک گھونٹ پیتی تھیں۔

نشہ کا خمار چڑھنا شروع ہوا تھا کہ ناچنے والیوں کو پھر حکم ہُوا۔ ساز پر پریوں کا ایک خاص ناچ، ایک رقیق، نازک، نورانی ناچ ناچا گیا۔

وہ گلابی، چمپئی، دھانی، ریشمی ساڑھیاں جو پریوں کے سڈول جسموں سے لپٹی ہوئی تھیں، وہ اس ناچ کے چکروں میں مل کر طرح طرح کے نئے رنگ پیدا کرتی تھیں، پریاں تیتری کی ہلکی پرواز کی طرح اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ٹھمک ٹھمک کے آتی جاتی تھیں۔ کبھی دو ایک دوسرے سے ملیں کبھی علیحدہ ہو جائیں، کبھی دو کے درمیان میں سے تیسری گزر جائے کبھی حلقہ بندھ جائے کبھی ٹوٹ جائے، اس ملنے، جدا ہونے چکر کھانے سے رنگ اور نور کا انحلال اور اجتماع ایسا مختلف ہوتا جیسے ہشت پہلو شیشے میں آفتاب کی کرنیں گزر رہی ہوں ان پریوں کا تھرک تھرک کر ملنا، پھر تتر بتر ہو جانا، شانوں کا ہلنا، بانوں کا بحر سنبل کی طرح لہرانا، نازک کمروں کا لچکے کھانا، جھک جھک کے دُہرا ہو جانا، یہ سب باتیں سلیس و بلیغ گتوں سے

رجو سازندے پریاں بجا رہی تھیں) مل کر ایک نشہ آور منظر پیش کرتی تھیں کہ کان موسیقی اور رقص میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور آنکھ نہیں بتا سکتی تھی کہ آیا موسیقی رقص کر رہی ہے، یا رقص نغمہ ساز ہے، کیا ہو رہا ہے۔

نسرین نوش ان تمام تموّجات رقص و آہنگ کو، ایک سہیلی صبح خنداں کے زانو پر سر رکھے ہوئے ایک بے پروا، لاابالیانہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی، اور ایسا نظر آتا تھا کہ وہ اُن چیزوں کی طرف زیادہ ملتفت نہیں، کیونکہ اس کی نگاہ کسی دُور نقطہ پر گڑی ہوئی تھی۔

یہ ٹیپ ٹاپ، یہ ناچ گانا، وہ رات دن دیکھتی تھی، اِس لئے اُس کی رُوحِ خفتہ کو جگانے یا اس کی دل میں حرکت پیدا کرنے کے لئے یہ کافی نہ تھے۔

اُس رات محل میں داخل ہونے کو اُس کا دل نہ چاہا! اس کی طبیعت میں، چاند کو دیکھ دیکھ کر یہ اُمنگ پیدا ہوتی تھی کہ اُس کے عُریاں جسم سے جا کر لپٹ جائے، وہ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی سہیلیوں نے، اس کی طبیعت کے بہلانے کے لئے لطیفے، کہاوتیں، بوجھ

پہیلیاں کہنی شروع کیں، کہ چاند اور سُورج میں کیسی دوستی ہے۔ شہد کی مکھیاں پھُولوں سے کیا کہا کرتی ہیں، بھونرا، چنبیلی کے کان میں کیا بھنبھنایا کرتا ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اُن نورانی آنکھوں میں نیند آنی شروع ہوئی، اُس کے نرم جسم کو سہلا سہلا کے، اُس کے دماغ کو تھپکا تھپکا کر ہلکے بادلوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے چاند کو پیش نظر کر کرکے غرض کہ عجب عجب دھوکے دے دے کے، نیند اُس کی آنکھوں میں چُپکے سے آگئی اور اُن گھنی پلکوں کو ملا دیا۔

نسرین نوش کا نیند میں جانا تھا کہ ناچ بند کر دیا گیا، لطیفے پہیلیاں ختم ہوگئیں۔ نہ صرف یہ بلکہ فوارے بند ہوگئے، وہ عندلیب جو پنجرے میں بیٹھی گا رہی تھی، چُپ ہوگئی، ہوا کی سنسناہٹ بند ہوگئی، تاکہ نسرین نوش آرام سے سوئے، تمام رامشگر پریاں، سہیلیاں، دبے پاؤں علیحدہ ہوگئیں، گھونگرو آہستہ آہستہ اُتار ڈالے گئے، اتنے میں سفید بازوؤں والی چھوٹی پریاں حلقہ باندھ کے آئیں، اور نسرین نوش کے گرد اُڑنے لگیں اُن کے پروں سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ یہ پریاں نسرین نوش کی نگہباں تھیں۔

دو تین منٹ بعد ایک بُڑھیا درختوں سے نکل کے جریب ٹیکتی ہوئی آہستہ آہستہ نسرین نوش کے پاس آئی اور نسرین نوش کے بدن پر جو چادر ڈال دی گئی تھی، اُسے چہرہ پر سے ہٹا کر غور سے دیکھنے لگی، اُس کے سوکھے چہرے پر آثار اطمینان ظاہر ہوئے۔ اور "الحمدُللہ" کہہ کے جیسی آئی تھی ویسی ہی غائب ہو گئی۔

یہ نسرین نوش کی ماں تھی۔ اپنی لڑکی کو نہایت احتیاط اور بدگمانی سے رکھتی تھی، اور اِس طرح ہر شام کو آ کر تحقیقات کرتی تھی۔

یہ معمّر عورت سوچا کرتی تھی کہ: "میرے بالوں کو سفید کرنے والے میرے دانتوں کو گرانے والے، میرے چہرے کو خراب کرنے والے یہ مرد ہی تو ہیں، ان کے ظلم ہی تو ہیں، اپنی اولاد کو مَیں ان مصیبتوں سے بچاؤں گی۔ اِسی لئے مَیں اس لڑکی کو اس جزیرے میں لائی ہوں۔ اُسے کھیل تماشے، دل بہلاوے، ہنسی دل لگی، آرائش و نمائش سب کچھ دونگی، لیکن مرد کیا شے ہے، یہ نہ جاننے دونگی وہ خلاکت جس کا نام مرد ہے، اُسے اس کے قریب نہ آنے دونگی

لیکن اگر ڈر ہے تو اتنا کہ مجھے اطلاع ہوئے بغیر اس جزیرے میں کوئی مرد نہ آ جائے، بہرحال اس وقت تو میری کُل تدبیریں مکمّل ہیں اور میرے دل کو اطمینان ہے۔"

ماہتاب، دھیما ہو ہو کے، غائب ہو گیا، مگر نسرین نوش کے جسمِ نازک کو نو طلوع آفتاب کے سُپرد کرتا گیا۔ سفید بازوؤں والی نگہبان پریاں ہٹ گئیں، اور اُن کے بجائے، سہیلیاں، اور گانے والیاں آگئیں۔ جنہوں نے نرم و نازک آواز سے اُسے جگانے کے لئے پیاری پیاری راگنیاں گانا شروع کیں۔ تھوڑی دیر میں نسرین پوش نے اپنی مخمور آنکھیں کھول دیں، اور انگڑائیاں لیتی ہوئی، اور اپنے پریشاں بالوں کو سنوارتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ پھر ایک صاف شفاف نہر کے کنارے، نیلوفر کے پھُولوں کی ایک چوکی پر جا کر بیٹھ گئی، پریاں بھی آ کر اُس کے گرد جمع ہو گئیں۔

مشاطہ پریوں نے نسرین نوش کا سنگار کیا۔ نسرین نوش نہر کے صاف پانی میں اپنے عکسِ جمال کو دیکھ رہی تھی۔ تیتریاں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی اُڑ رہی تھیں، نہر کی روانی سے

نرم صدا پیدا ہو رہی تھی، سہیلیوں نے پھر ہنسی کی باتیں شروع کیں، جن کو سُن سُن کر وہ پیارے باریک ہونٹ تبسم میں کھُل کھُل جاتے تھے۔

سہیلیوں اور خادمہ پریوں کے نام گُل چکاں، زہرہ جبیں ناز آفریں، موج نور بعضوں کے نام پھولوں پر مثلاً نیلوفر، سوسن وغیرہ، بعضوں کے پرندوں کے اوپر، مثلاً طاؤس خرام، کبک ادا وغیرہ وغیرہ تھے اور ان سب کے نام اور عنوان کے مناسب ان کا لباس تھا۔

سنگار کے بعد، اس صبح کے لئے ایک خاص رنگ کا لباس پہن کر نسریں نوش نیلوفر کے پتوں کی کشتی میں بیٹھ کر سہیلیوں کے ساتھ تھوڑی دُور تک نہر میں گئی، پھر یہ سب کنارے پر پہنچیں، جہاں بلّور اور پھولوں کی ایک بگھی تیار کھڑی تھی، اِس بگھی میں دو مادہ سیمرُغ جُتی ہوئی تھیں، اور اس انتظار میں کہ اُن کی مالکہ بگھی پر سوار ہو گی، آمادۂ روانگی کھڑی تھیں، جوئے رواں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نسریں نوش گاڑی میں سوار ہوئی، اور جوئے رواں کو اپنے پاس

بٹھا کر "دیارِ گل" کو چلنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے سُنتے ہی چند چھوٹی چھوٹی پریوں نے جو چھوٹے چھوٹے بگل لئے کھڑی تھیں، کوُچ کا بگل بجایا، اور اس تزک و احتشام کے ساتھ سواری روانہ ہوئی، سامنے، طاؤس، کبوتر، قمریاں، طوُطی، ناچتے، ہوا میں اڑان بھرتے، گاتے چہچہاتے اور طرح طرح کے تماشے کرتے جاتے تھے۔

سڑک پر پھول کی پتیاں، گلال، اور چاندی کے ذرّے بکھرے ہوئے تھے، جو پہیوں کے چلنے سے اڑ اڑ کر، گاڑی کے بلوریں پہیوں میں، پرندوں کے پروں میں جم جاتے تھے، اور اس قافلے پر قوسِ قزح کا رنگ پیدا ہو جاتا تھا۔

آفتاب، اُفق سے اپنے نوُرانی بالوں کو سنوارتا ہوا، کچھ اونچا ہوا تھا، کہ یہ قافلہ اس بلدۂ شعر و خیال میں جسے نسرین نوش نے "دیارِ گُل" کہا تھا، پہنچا۔ یہاں کی وادی حقیقتاً وادیٔ گُل تھی۔ نسرین نوش کی تشریف آوری کی خوشی میں، تمام غُنچے ایک دم کِھل گئے؛ اور اُن کی خوشبو نکل نکل کے اُس کے جسم کو کندھوں کو، چہرے کو احاطہ کر کے چوُمنے لگی۔ نسرین نوش گاڑی سے اُتری؛

اتنے میں سہیلیاں، نوکرنیاں، اور سازندے وغیرہ بھی پہنچ گئیں۔

اب نسرین نوش نے اس زمان و مکانِ لطافت میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا، سہیلیاں، تعظیم اور احترام کے انداز سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، اونچے درخت بھی اس ملکۂ ملاحت کے سامنے جھک جھک کر اُس کی خدمت میں پھول پیشکش کرتے تھے، اور نسرین نوش اُن پھولوں کو اپنے اُن پیارے ہاتھوں سے (جن میں اور پھولوں میں صرف اِس قدر فرق تھا کہ یہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت تھے) چھو چھو کر سہیلیوں کو ایک عظمت آمیز نیم غمزہ سے حکم کرتی تھی کہ "انہیں توڑ دو"۔ زہرہ جبیں، گل چکاں کی گود ان پھولوں سے بھر گئی، ان پھولوں کا ایک تاج بنایا گیا، جسے نسرین نوش نے پہنا۔ غرض کہ اس طرح، نسیم صبح کے ساتھ اور نسیم صبح کی مانند سب آہستہ آہستہ چل کے ایک اونچے موقع پر پہنچیں، جو مطلع آفتاب کے مقابل تھا۔ نسرین نوش کھڑی ہو کر آفتاب کی طرف جھکی اور پھر سیدھی ہو گئی، ازاں بعد اپنے ہاتھ کو چوم کر، گویا سورج کو ایک بوسہ بھیجا۔ یہ ایک آئین آفتاب پرستی تھا،

ہو جاتی، گویا بادِ نسیم پھُولوں میں ہلکے ہلکے چل کے رُک گئی چاندنی رات ہوتی تو ایک دو سہیلیاں ساتھ لے کر سیر کو نکل جاتی، اس وقت نسرین نوش کا چلنا، اس نہر کے پانی کی مانند ہوتا تھا، جو بلّور کی زمین پر بہ رہی ہو۔ اور جس کے پانی کو معطّر نسیم جُنبش دے رہی ہو، جس کے کنارے پھُول کھلے ہوں، اور بُلبلیں اُڑ رہی ہوں۔

نسرین نوش پانچ برس کی تھی جب اس جزیرہ میں پہلے پہل آئی تیرہ برس سے اسی طرح، خوشبوؤں میں، آرام میں، نازو نعم میں، بے فکریوں میں، لاڈ پیار میں زندگی بسر کر رہی ہے، اور مجہول غیر مجسم خیالات میں مستغرق رہ کر، دن ہنسی کے ساتھ، اور رات متبسّم خواب میں گزارتی ہے۔

لیکن، ایک صبح خلافِ معمول اُس کے دل میں ایک جلن محسُوس ہوئی۔ اُٹھی، کاشانۂ بلّور کے قریب جو نہر بہتی تھی اُس تک گئی، اور نہر کے اندر جا کر لیٹ گئی اور دیر تک اس میں بے حرکت پڑی رہی پھر نکل کے اور بدن کو سُکھا کے، سفید ریشمی بستر پر جا لیٹی۔

نسترین نوش پر ایک سخت نیند غالب ہوئی، اور وہ شام تک سوتی رہی یہاں تک کہ سُورج ڈھلا، سُورج کی شعاعیں اُس پر آگر پڑیں اور وہ جاگی، اُس وقت اس کی طبیعت ایک ایسی شے چاہتی تھی، ایک ایسے مبہم وجود کی آرزو کر رہی تھی جو اُس کے بازوؤں کو پکڑے، کمر کو سنبھالے، اُس کے جسم کو اٹھالے، ایک غیر معنی تمنّا اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک ذات، ایک وجود آئے، جو اس پر قادر ہو، جو اس پر حاوی ہو۔

اس نے دیکھا کہ اُس کے پاس ایک سفید براق ہنس پھر رہا ہے، اُسے ہی اُس نے گود میں لے لیا، اور اس کے سفید سینے کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیا، اور اس کی گردن کو اپنی گردن سے ملا دیا۔ اور اپنی تمام قوت سے اُسے بھینچنا شروع کیا۔ اور اس طرح پرند کے نرم پر دل میں، اپنی آنکھوں کو کچھ کھولے، کچھ بند کئے بدن کو جُھکائے دیر تک بے حرکت پڑی رہی۔

نسترین نوش، اُن خوشبوؤں سے، اُن رنگوں سے، اُن پھولوں سے، اُن کھیل تماشوں سے، اُکتا گئی تھی، اور اُن سے

چھٹکارا چاہتی تھی۔

اب پھولوں کا اُس پر نثار ہونا، اُس کی رُوح کو مشغول نہ کرتا تھا، ناچنے والیوں کے ناچ، اور عشوے اور غمزے اس کے دل کو نہ بہلاتے تھے، سہیلیوں کا اس کے بدن کو ملنا، اُسے آرام نہ دیتا تھا۔ وہ ایک شے تلاش کرتی تھی جسے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا ہوگی کیا نہ ہوگی، ایک مبہم چیز چاہتی تھی جو اُسے دُکھ دے، اُس کے دل میں درد پیدا کرے، احساس پیدا کرے، اُسے مسل ڈالے۔ ایک ایسی پُر قوّت، پر جرأت شے کہ باوجود اُس کے حُسن وجمال کے، باوجود اس کے کہ وہ جزیرے کی ملکہ تھی، اُس سے نہ دبے، اُس کے رُعب میں نہ آئے، بلکہ اُسے پکڑے، اُسے مارے، ٹکڑے کر ڈالے +

خارستان

تاڑ، برگد، سال، چیڑ اور ببول وغیرہ درختوں کے ایک اصلی اور قدیم جنگل میں سوکھے پتّوں پر درندوں کے چلنے کی آواز، بیچ جنگل سے اُٹھنے والی آندھی کے شور سے مل کر سمندر کے خروش سے باتیں کر رہی تھی۔ ہر زندہ شے، اس فریاد کار ظلمت میں تدارک غذا و گذران زمان کے لئے کبھی شیرانہ جرأت سے کام لیتی تھی، اور کبھی ایک بودی جھجک سے کانپ اُٹھتی تھی۔

ساحل کے قریب جہاں جنگل ختم ہوتا ہے، ایک تنہا موقعے پر ایک چٹان کے کنارے ایک مرد، غمگین، بے حرکت حالت میں شام کے وقت شام کے ستارے پر نظر گاڑے ہوئے ہے۔ چہرے کی

سُرخی اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ رگوں میں پُر صحت خُون دوڑ رہا ہے۔ کندھوں تک لٹکے ہوئے بال گھنے اور چمکدار ہیں اور بتا رہے ہیں کہ جسم کا نشو و نما جوش پر ہے۔

اس مرد نے انگڑائی لی اور دُور سے ایک شیر کی گرج کو مُسکرا کے سُننا شروع کیا ---------

----

آریاؤں اور ہندوستان کے قدیمی باشندوں سے بھی پہلے ایک قبیلہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لنکا کے جزیرے میں جا بسا تھا۔ اس قبیلے کی بیتاب طبیعت نے ایک خاندان کو مجبور کیا کہ جزیرۂ سرندیپ سے نقل مکان کر کے اللہ توکل کسی نئے مقام کی تلاش میں نکل پڑے۔ کچھ لنکا میں زندگی کی دشواریاں کچھ قدیم انسان کی سیماب وار طبیعت، غرض کہ یہ سرندیپ میں بھی نہ ٹھہرے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے تئیں بحرِ ناپیدا کنار کے سُپرد کر دیا۔ سمندر کے طوفانوں نے بہت سی کشتیوں کو غرق کر ڈالا صرف ایک کشتی جس میں رئیس قافلے کا بیٹا خارا اور سات آدمی

اور تھے، جزیرۃ العرب کے جنوب غرب میں ایک خالی جزیرے کے کنارے آ لگی۔ عورتیں کچھ تو سمندر میں ڈوب چکی تھیں، دو ایک جو بچی تھیں وہ مصائبِ سفر سے جاں بر نہ ہوئیں۔ خارا کی عمر اس وقت چار برس کی تھی۔ ان سات آدمیوں نے جو اس جزیرے تک پہنچے تھے، اُس قسمت کی ضد پر جس نے اُنہیں اس جزیرے میں لا پھنسایا تھا اور گذشتہ پُرلطف زندگی کی یادگار کے طور پر اس بچے کو نہایت چاؤ اور پیار سے پالا، کشتی میں جس قدر آلات و اسلحہ تھے، یہ لوگ انہیں لے کر نکلے تھے اور سب سے پہلا کام جو اُنہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ خارا کی حفاظت کے لئے زیرِ زمیں غار نما ایک گھر بنایا اور ایسا انتظام کیا کہ اس میں بھیڑیا، چیتا وغیرہ کوئی درندہ نہ گھس سکے۔ ان سات آدمیوں میں سے ایک آدمی ہر وقت خارا کی حفاظت کے لئے رہتا تھا، باقی صید و شکار کو نکل جاتے شکار کا گوشت اور بکریوں کا دودھ لاکر، اس بچے کو پالتے تھے۔ خارا نے پہلی بات جو سیکھی وہ اپنے تئیں درندہ حیوانوں سے بچانے کے لئے ان کا مقابلہ کرنا تھا۔ ابھی جزیرے میں آئے چھ ہی مہینے ہوئے تھے، کہ ایک دن خارا کے محافظ کو بڑی مسرت کا

دن ہوا یعنی غار کے سامنے سے ایک چڑیا اُڑ کر جا رہی تھی، خارا نے ایک پتھّر کھینچ کے مارا، جس سے چڑیا زخمی ہو کر زمین پر آ پڑی۔ اس واقعہ پر بڑا جنگل میں منگل منایا گیا، اور ان ساتوں آدمیوں نے مل کر اپنے رئیس زادے کی شان میں گانے گائے۔

اب خارا ہر شے کو جس پر اُس کا بس چلتا، توڑتا، پھوڑتا، مارتا اُکھاڑتا تھا۔ کسی چڑیا کا گھونسلا ہاتھ لگ جاتا تو اُسے توڑتا، انڈوں کو پھوڑتا، بچّوں کا گلا مروڑتا تھا۔

ایک دن (کئی سال کے بعد) خارا نے پہلی دفعہ ایک بارہ سنگھا شکار کیا، ایک بڑا پتھّر اس کے سر پر مارا جس کی ضرب سے بارہ سنگھا گر پڑا۔ خارا اُسے کھینچ کھینچ کر غار تک لایا اور اپنے ساتھیوں کو فخر کی ادا سے دکھایا۔ اُس دن ساتھیوں نے پھر عید منائی اور خوشیاں کیں۔ اس بارہ سنگھے کے سر کو غار کے مُنہ پر لٹکایا۔ خارا نے اس کی کھال سے جسے اُس نے خود صاف کیا اور سُکھایا تھا، اپنے لئے ایک لباس بنایا۔ یہاں ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھّر تھے اور پتھریلی زمین، اُونچی چٹانیں خوف ناک گھاٹیاں، اِس جزیرے کی اجزائے مرکبہ تھیں۔ جب

کبھی آندھی اُٹھتی تو جزیرے کے اُونچے اور تناور درختوں میں سائیں سائیں کرکے شور مچاتی۔ کسی دن آندھی کی شدّت سے درخت ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کے تڑاخ تڑاخ ٹوٹ کے طغیانی انگیز سمندر میں گرتے تھے اور جزیرے کے درندوں کا شور سمندر کے پرندوں کی چیخوں سے ایک محشر ہیجان پیدا کرتا تھا۔ اُس وقت اس گوشۂ عافیت یعنی خارا کے غار میں ایک عمیق خوف طاری ہوتا تھا۔ خارا اور اُس کے ساتھی ایک دوسرے سے ملے ہوئے، ناامیدی، نفرین اور ڈر کے ساتھ اس وحشی غلغلہ کو سُنتے تھے اور کانپتے تھے۔

کسی رات کو مُوسلادھار مینہ پڑتا اور پانی ریلا کرتا ہُوا اس غار تک آتا، بجلی چمک چمک کے، تڑپ تڑپ کے، بادل گرج گرج کے اس جزیرے کو گھیر لیتے، قُدرت کے اس شور شغب میں، شیر کی دھاڑ، ہاتھی کی چنگھاڑ اور درندوں کی چیخ پکار قیامت برپا کردیتی تھی۔ کبھی جزیرے کی ایک طرف کوہ آتش فشاں آگ اُگلتا اور اپنے چاروں طرف ہر زندہ شے کو جُھلسا دیتا تھا۔

ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتّھر تھے۔ یہ سات آدمی تدارکِ معیشت

کے لئے صبح نکلتے تھے اور شام کو واپس آتے تھے، مگر اس طرح کہ کانٹوں سے پاؤں زخم کھائے ہوئے، ہاتھ چھدے ہوئے، چہرے چھلے ہوئے، غار میں بیٹھ کر اُن زخموں کو دھوتے، لیکن اس وقت ان زخموں کو دھونے، اور چہرے اور ہاتھوں کو روغن ملنے کے لئے، عورت کے ہاتھ کی ضرورت محسُوس ہوتی تھی۔ اس ضرورت کو محسوس کر کے ان میں کا ایک بڈھا آدمی غار کے سامنے کے ایک پتھّر پر بیٹھ جاتا اور سفید لٹوں کو ہلا ہلا کے اور زخمی سینے کو کھول کے سمندر کی پُر عناد اور ظالم موجوں کی طرف گھونسا تانتا اور قسمت پر لعنت بھیجتا۔

غارا اس آفتاب کے تلے اس کٹیلی پتھریلی زمین پر، ان درندے حیوانوں میں پلا تھا، اس کے ہاتھ سیکڑوں مرتبہ چھل چکے تھے، سینے پر ہزاروں مرتبے کھرچیں لگ چکی تھیں، چہرہ تمتما کے تانبا ہو گیا تھا۔

غرض کہ ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھّر تھے، کبھی اُس کے خُون کا جوش اُسے آدھی رات کو خواب سے بیدار کر کے

باہر لے جاتا اور ایک سائر فی المنام شاعر کی طرح جو فضائے لامتناہی کی سیر کر رہا ہو، خارا بھی ایک چٹان پر بیٹھ کر خیالات میں غرق ہو جاتا، یہ ظاہر ہے کہ خیالات اس جزیرے اور خارا کی کل زندگی کی مناسبت سے پُر حدّت ہوتے تھے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کبھی کبھی، نرم و نازک خیالات ایک سفید چھوٹی چڑیا کی طرح اس کے دماغ کے سامنے اُڑتے نظر آتے تھے، اور کبھی اس کی سیاہ آنکھوں کے سامنے اِس طرح مجسّم ہوتے تھے جیسے ہُوا چل رہی ہو اور درختوں کا متحرک سایہ کانپ رہا ہو۔

خارا کی عُمر اس وقت بیس برس کی تھی، حسّیات کا ہجوم تھا اور اکثر راتیں وہ کسی پہاڑی پر درختوں میں گُزارتا۔

ایک شام کو غار میں آیا اور بستر پر جا پڑا، تین دن تک بخار میں بے ہوش پڑا رہا۔ اس بخار کی حالت میں اس کی پیاس بجھانے کے لئے اور سُوکھے ہونٹوں کو تر کرنے کے لئے اُس کے ساتھی اُسے جگا کر پانی دینا چاہتے تھے مگر وہ نہیں جاگتا تھا۔ اس وقت وہ بُڈھا اپنے سوکھے ہاتھوں کو جس میں رگیں اُبھری ہوئی نظر

آتی تھیں اُٹھا اُٹھا کے کہتا:۔

"آہ! ایک عورت، ایک عورت۔"

اور پھر خارا کی تیمار داری کرتا۔ آخر خارا نے آنکھیں کھولیں اور اس کی حالت بہتر ہونی شروع ہوئی، تاہم نقاہت باقی تھی۔ ایک شام، یہ ہمراہی خارا کے بستر کے گرد بیٹھے ہوئے تھے کہ بُڈھے نے ایک پُرانا راگ جسے وہ بھول نہیں گیا تھا۔ گُنگُنانا شروع کیا:۔

"جینا تو اک نیند ہے پیارے، پریم ہے اُس کا سپنا۔"

خارا نے پوچھا:۔

"جینا کیا چیز ہے؟"

بُڈھے نے جواب دیا:۔

"پریم"

"پریم کیا ہے؟"

"عورت"

اس طرح خارا سوال، اور بُڈھا توضیح کرتا تھا۔ غرض کہ نوجوان

کو معلوم ہوا کہ زندگی میں کانٹے اور پتھر ہی نہیں ہیں، بلکہ پھول اور خوشبوئیں بھی ہیں۔ چیرنا، پھاڑنا ہی نہیں، بلکہ ملنا اور گلے لگانا بھی ہے۔

اس کے بعد یہ نوجوان اپنے ہمراہیوں سے اکثر علیحدہ رہتا اور اکثر سوچا کرتا، دن میں اسے اکثر کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کسی تنہا جگہ پر نکل جاتا اور وہاں ایک مرمر کے ٹکڑے کو لے کر بڈھے کی بیان کی ہوئی تصویر کے موافق ایک مُورت بنانا شروع کرتا، جس کی پوری شکل اس کے خیال خانۂ دماغ میں پھرتی ہوتی تھی۔ پہلے سر بنایا، پھر سینہ تراشا، پھر ہاتھ نکالے۔ اس جزیرے کی چٹانوں میں اور سمندر کے کنارے زمرد، الماس، لعل، یاقُوت وغیرہ چمکدار اور رنگین پتّھروں کی بہت کثرت تھی۔ خارا نے اُنہیں جمع کر کے اس مُورت کی آنکھ سفید اور سیاہ الماس سے، دانت موتی سے، ہونٹ لعل و یاقُوت سے بنائے ایک برس کامل اس شغل میں بڑی حرص اور بڑے شوق سے مشغول رہا۔ ایک دن ہمراہیوں نے آکر اسے دیکھا اور بہت

تعجب کیا، لیکن بُڈھا ہنسا اور کہنے لگا:-

"اچھّی ہے مگر حقیقت سے بہت دُور ہے"

تاہم خارا کے لئے یہ مُورت ایک بدیعۂ خیال تھی۔ اس نوجوان نے اپنے حسیات کی تمام قوت اس مرمر میں صرف کی تھی۔ صبح سے شام تک نظر اس مُورت پر گاڑے رہتا اور اِس درجہ مستغرق ہوتا کہ ہمراہی کھانے کے وقت آکر اُسے جبراً وہاں سے لے جاتے اور اس وقت بھی خارا مُورت کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور پُرشوق نظریں اُس پر ڈالتا۔

اِس طرح مہینے گزر گئے۔ خارا پتّھر اور سلیں جمع کرتا تھا اور اپنے خواب اور خیالوں کی تصویریں ان پتھروں سے بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے خوف تھا تو صرف اس بات کا کہ بڈھے کے اعتراض اور استہزا سے یہ بچیں گی یا نہیں۔ کبھی ایک مُورت بناتا، وہ ٹھیک نہ ہوتی، اُسے توڑ دیتا، دوسری شروع کرتا۔ کبھی کبھی دوڑا دوڑا بڈھے کے پاس جاتا اور اُس سے سوال کرتا۔

"پھر بتانا، عورت کیا ہوتی ہے، کیسی ہوتی ہے؟"

بڈھا رواں بادلوں پر اپنی نظر گاڑ کر اس کے سوال کا جواب دیتا اور کہتا :-

"عورت! عورت!! آدھا میوہ، آدھا پھول ہے"

پھر چپ ہو جاتا اور رونے لگتا، خارا گھنٹوں اس بڈھے کی آنکھوں پر سوال کی نظر ڈالے ہوئے، اس کی باتوں کو سنتا تھا۔ اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بڈھا اُٹھ کر، خارا کو لے کر جنگل میں ایک طرف جاتا اور کسی تاڑ کے نیچے دو جرانے، اپنی گردن، ایک دوسرے سے ملائے کھڑے ہوتے انہیں دکھاتا اور کہتا :-

"دیکھتے ہو، سمجھتے ہو؟ بس!"

خارا کچھ نہ سمجھتا اور پھر سوال آمیز نظروں سے بڈھے کے چہرے کو دیکھتا، خارا نے کئی مُورتیں تراشیں، اس میں وہ بغیر اُستاد کے محض اپنی طبیعت کے زور سے ماہر ہو گیا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اُس نے خود ہی یہ فن ایجاد کیا۔ اس کی حاصلِ عمر یہ مورتیں تھیں اور وہ ان سے بے حد محبّت کرتا تھا، محبّت ہی نہیں پرستش کرتا تھا۔ یہ مقام گویا اس کا معبد تھا۔ مبازرۂ حیات سے تھک کر

یہاں آتا اور گھنٹوں مبہوت نظروں سے ان مُورتوں کو دیکھا کرتا۔ اور سوچا کرتا کاش یہ مورتیں سمندر پار کی حقیقت سے خبردار کریں اور بتائیں کہ اس پُرطوفان سمندر کے اُس طرف، ان مورتوں جیسی زندہ مخلوق ہے کہ نہیں۔ کبھی اپنے خیالات کے تخلیل کرنے سے عاجز ہو جاتا، تو غصّے میں آ کے ایک سباعانہ وحشت سے کسی مورت کو توڑ ڈالتا پھر رنج کرتا اور نکل کھڑا ہوتا اور جو جانور ملتا اُسے بعنوانِ انتقام مار ڈالتا۔

- -

رات کا وقت تھا گھنے درختوں میں، خارا چیتے کی کھال بچھائے بیٹھا تھا کہ اتنے میں پاؤں کی خفیف آہٹ سُنائی دی، تھوڑی دیر میں آہٹ زیادہ واضح ہوئی۔ اُس نے سر پھرایا تو دیکھا کہ ایک بارہ سنگھا آ رہا ہے، اتنے میں ایک لومڑی نکلی۔ بارہ سنگھے نے اپنے سینگوں پر لومڑی کو اُٹھا کے پھینک دیا۔ یہ بارہ سنگھے کی شوخی اور کلیل تھی۔ لیکن یہ شوخی اور کلیل بہت دیر تک نہ رہی کیوں کہ ایک تیندوا بارہ سنگھے پر لپکا، بارہ سنگھے نے اپنی جان بچانے

کے لئے بھاگنا شروع کیا۔ خارا نہایت شوق سے اس گیرودار اور بھاگ دوڑ کو دیکھ رہا تھا۔ بارہ سنگھا اپنی تمام قوت سے دوڑ رہا تھا، یہاں تک کہ تھک کر اس کی رفتار میں سُستی معلوم ہوئی، پسینہ میں شرابور ہو گیا اور ہانپنے لگا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اُسے اپنی جان کی سلامتی کی اُمید نہ رہی تھی۔ چند منٹ کے اندر تیندوا بارہ سنگھے تک پہنچ گیا اور اُسے دبوچ لیا۔ خارا تعجّب کر رہا تھا کہ بارہ سنگھا بہت جلد مغلوب ہو گیا اور اس کا دل چاہتا تھا کہ بارہ سنگھے کو کسی طرح مدد پہنچائے کہ اتنے میں ایک گرج سُنائی دی اور ایک بڑا سا بہ جھپٹتا نظر آیا، سر پھرایا تو کیا دیکھتا ہے کہ یکّہ تازِ میدانِ شجاعت، بادشاہِ بیابانِ وحشت یعنی شیر چلا آ رہا ہے۔

شیر نے، تیندوے اور بارہ سنگھے پر ایک پُر غیظ و غضب نظر ڈالی اور پھر ایک پُر ہول دھاڑ کے ساتھ پھلانگ مارتا نظر آیا۔ تیندوا پہلے تو باوجود اپنی تھکن اور ضعف کے، ہر چہ بادا باد آمادۂ مقاومت معلوم ہوتا تھا، لیکن شیر کی زہرہ ریز گرج نے جو اُس نے اپنی تمام قوت سے کی تھی، تیندوے کے حواس باختہ کر دیئے

اور وہ محجوب اور منفعل، کانپتا ہوا، اپنا شکار اور اپنی نخوت شیر کے لئے چھوڑ گیا۔ تھوڑی دیر تو تیندوے نے آثار غصہ ظاہر کئے تھے اور اُس کی طرف گھور کے دیکھا تھا، لیکن شیر کی آتش ریز آنکھوں سے کون آنکھیں ملا سکتا تھا۔ ان آنکھوں کا دوچار ہونا تھا اور گرج کر نکلنا تھا کہ تیندوے نے ہار مان لی۔ شیر نے بارہ سنگھے کے جسم پر اپنے پنجے گاڑ کر اُسے ٹکڑے کرنا شروع کیا۔ خارا جو اس سے پہلے بارہ سنگھے اور تیندوے کی کشمکش، بے پروائی سے اور بغیر خوف کے دیکھ رہا تھا، اب ذرا سنبھل بیٹھا۔ اُس کے دل میں خوف اب بھی نہ تھا، لیکن ذرا احتیاط سے بیٹھا ہُوا تھا۔

اب شیر لپ لپ کر کے خُون پی رہا ہے، ہڈیوں کو چبا رہا ہے اور جُھوم رہا ہے۔ غلبہ اور کامیابی کے نشے میں اپنی دم دائیں اور بائیں مار رہا ہے اور اس پُرلطف ضیافت کو کھاتے وقت مزے میں آ آ کر کبھی اپنا سر اُٹھا کے اوپر کو دیکھتا ہے۔

ایک دفعہ اُس نے اپنی دُم اُٹھا کے اور اپنے اگلے پاؤں بارہ سنگھے کے مُردہ جسم سے ہٹا کے نظرِ تفتیش سے

اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اُس کے سر اور اُن ہڈیوں کو جن پر ابھی گوشت باقی تھا چبانے کے لئے وہاں سے گھسیٹ کر لے جانا شروع کیا۔ اتنے میں شیر کی نظر خارا پر پڑی اور اس زرد خُونخوار طاقتور مخلوق کی آنکھیں اس جزیرے کے جوان انسان سے دوچار ہوئیں۔ آدھ گھنٹہ پہلے خارا اس احتشام مجسم یعنی شیر کو اس کی ہیبت اور طاقت سے متاثر ہو کر دیکھ رہا تھا اور اس غالب مغرور کی دل میں عزت کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت جب کہ شیر اس کے سامنے تھا، اس وقت ایک قدرتی جوش مقابلہ سے وہ اس کی طرف بڑھا، شیر بھی جاتے جاتے رُک گیا اور شاخوں اور پتوں کو اپنے پاؤں کے نیچے دباتا، توڑتا اور کھڑ بڑ کرتا ہوا خارا کی طرف چلا۔ غرض کہ لڑائی کی ٹھن گئی اور خارا نے شیر کے بائیں طرف سے اُس پر حملہ کرنے کی ٹھہرالی۔

شیر نے سر اُٹھا کر پھر اُسے دیکھا اور اس پر کُودنے والا ہی تھا کہ خارا نے ایک سیکنڈ رائگاں نہ کر کے کمان کو پوری طاقت سے کھینچ کر تیر چھوڑا۔ تیر ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اُس کی

طرف گیا اور گردن میں گھس گیا۔ اس کے ساتھ ہی خارا نے اپنی ڈھال سنبھال کر اور ایک ہولناک "ہاؤ" کا نعرہ مار کر بائیں طرف پھرتی سے پھر کر اپنا گرز شیر کی گدّی میں (جو چھلانگ مار کر اس پر چھا گیا تھا) مارا۔ پھرتی اور طاقت خارا کے جسم میں بچپن سے ایسے مشاغل میں رہنے کی وجہ سے ہم جیسے آدمیوں کی سی نہ تھی پس اُس نے اِدھر اپنی تمام قوت بازو سے گرز مارا اور اُدھر اپنی کمر سے برچھی نکال کے اب مارے غصّے کے دیوانہ شیر کے پیٹ میں پوری گھسو دی، اس دفعہ اس درندہ جانور نے پیچ کھا کے خارا کے بائیں بازو کو پکڑنا چاہا لیکن اُس کے مُنہ میں خارا کی ڈھال جو وہ بائیں ہاتھ میں لئے ہوئے تھا آ گئی اور شیر نے شدّت غضب و درد میں اُسی کو چبانا شروع کیا، لیکن اِس عرصہ میں بے حد خون شیر کے جسم سے نکل چکا تھا اور اُس پر ضُعف طاری ہونا شروع ہو گیا تھا۔ خارا نے ایک دفعہ پھر پہلے کی طرح نعرہ مار کے اور پہلی جیسی قوت سے برچھی کو گھُسا دیا۔ آخر کار شیر اپنے غرور جنسی کے باوجود زمین پر آ رہا۔ لیکن نوجوان نے اس گرنے کو اور اس

مغلوبیت کو حیلہ تصوّر کیا اور برچھیوں پر برچھیوں کے وار کرتا رہا۔

مگر اب شیر کی زرد، بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، پنجے پھیلے تھے، مُنہ بغیر نفس کے کشادہ تھا، جس میں سے اُس کے بڑے دانت باہر نکلے ہوئے تھے جو خُون سے سُرخ ہو رہے تھے یہ وہی شیر تھا جس کی مہیب آواز اندھیری راتوں میں ہر جاندار کو کپکپا دیتی تھی وہی شیر اب اُس کے پاؤں کے تلے مسکین حالت میں پڑا ہوُا تھا۔ یہ خیال خارا کے دل میں گزرا، تو اس کا سینہ ایک شیریں غُرور جلاوت سے اُبھرا، اور وہ ایک خودکام نمائش کے ساتھ اپنی تیر و کمان، ڈھال، برچھی اور گُرز کو ایک جگہ رکھ کے نہایت فخر کی ادا سے شیر پر بیٹھ گیا اور متخیّل اور متفکّر نظروں سے مشرق میں آہستہ آہستہ اُبھرتے ہوئے نورپاش ماہتاب کو دیکھنے لگا۔

رات کی سیاہ پلکیں کھُلنے کے بعد صبح کا رنگین نور آسمان میں ادھر اُدھر سنہرے تیر پھینک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تیر، تیز اور پُرحدّت ہونے شروع ہوئے اور نوجوان کی آنکھیں صبح کے وقت اور موقع اور گذشتہ واقعہ کی یاد سے پُرنور اور اس کا دل دُور

سے دکھائی دینے والے سمندر کے شور کو سُن سن کر ذوق حیات سے مستفید ہو رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ نہایت پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ، رنگوں میں لپٹی ہوئی ایک شے صبح کے ایک مجسم ٹکڑے کی طرح ہوا میں تیرتی ہوئی، خارا سے کچھ دُور زمین پر آ رہی۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہلے تو مشکوک اور مبہم اور پھر عیاں اور واضح ایک شکل لطیف پیدا ہوئی۔

خارا کا رفیق بڈھا، جب کبھی نہایت تھک جاتا، یا کسی اضطراب میں ہوتا یا اور کسی تکلیف سے بیتاب ہو کر "عورت... عورت" کہہ کہہ کے آہیں بھرا کرتا تھا اور خارا پُوچھتا تو بیان کرتا کہ وہ کیا شے ہے غرض کہ یہ نازک شے، اُس بڈھے کی بیان کی ہوئی چیز سے بہت ملتی تھی اور اُس مُورت سے، جو اُس نے بڈھے کی تعریف کے مطابق پتھر سے تراش کر بنائی تھی، بہت مشابہ تھی۔ اُس کو دیکھ کر نوجوان کا دل ایک عجیب پُرشوق رقت سے کانپنے لگا۔ اور اُس نے اُس کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیئے اور سوچنے لگا کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ اُس کا دل چاہتا تھا کہ دوڑ کر اُس سے جا ملے، اُسے پکڑے لیکن اُس سے شیر کی طرح

لڑائی نہیں لڑنا چاہتا تھا، بلکہ یہ چاہتا تھا کہ یہ شکار جو اس قدر رنگوں میں اس قدر محبت آمیز احتشام اور ایسی نزاہت کے ساتھ رہتا ہے، آیا ہے اس شکار کو آہستہ آہستہ جا کر نہایت ہلکے سے چھوئے اور اُسے خوف نہ دلائے، ایک بھولا بھٹکا کر، چھوٹے چھوٹے شکار کو پکڑے۔ سہ بچا کے دیں اپنا ایک ہوں؟ اور یہ سوچ کر، سب آلات حرب ایک طرف رکھ دیئے اور دبے پاؤں اُس کی طرف چلنا شروع کیا۔ دو قدم نہ رکھے تھے مگر کہ جیسے نسیم کسی چھوٹے پودے کو ہلاتی ہے، یہ خیال دلفریب بھی جنبش کھا کے بادلوں کی طرف ہٹنے اور غار سے دُور ہونے لگا اور ایک منٹ کے بعد، زمین پر چٹان کے ٹکڑوں اور پتھر کے روڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

عمر میں یہ پہلی دفعہ تھی کہ غار رو دیا۔ غار کو نہایت رنجیدہ حالت میں واپس آیا اور اپنے ساتھیوں کو ساری عمر گزشتہ سنائی۔ ان میں سے بعضے کہنے لگے "یہ خیال تھا" اور بعضوں نے کہا "نہیں تم نے خواب دیکھا ہے"۔

شیرازہ

(۲)

ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے۔ ایب خارا سوچا کرتا تھا کہ کیا ان پتھروں اور کانٹوں سے رہائی ممکن ہے کہ نہیں، کیا اُس زخم کا جو اُس کے دل میں ہے کوئی علاج ہے کہ نہیں۔ دوسرے اُفقوں کو کشف کرنے، نئے شکار، شکار کرنے، اس کے قعرِ جان میں جو خالی خالی ایک کونا محسوس ہوتا تھا، اسے بھرنے اُس کے دل میں جو ایک نامعلوم کمی تھی اُسے پورا کرنے کی آرزو اُسے پاگل کئے ہوئے تھی۔ وہ بیمار نہ تھا۔ کھانا پہلے کی طرح کھاتا ہے، بھوک کھُل کے لگتی ہے، درندوں کا شکار پہلی طاقت و قوت سے کرتا ہے، زندہ رہنے کی خواہش قائم ہے، ہر لڑائی اور مقابلے میں جیتنے کی خواہش باقی ہے۔ پھر یہ ہر جگہ اور ہر وقت جو کمی اُسے محسوس ہوتی ہے، یہ کیوں؟ یہ کس لئے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا، اُسے سمجھنا چاہتا ہے؟ لیکن اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر نہیں کرتا۔

جب یہ لوگ جزیرے میں آئے تھے اُس وقت سے اس وقت تک یہاں سے چھٹکارا پانے کے خواب تو بہت دیکھے، لیکن سمندر میں پہلی دفعہ مصیبت اُٹھانے کے بعد کسی کی ہمّت نہ پڑتی تھی کہ پھر اُن طوفان خیز، بے رحم، کس ناشناس موجوں کو اپنی جان سپرد کردے، پس سوائے اس کے کہ اس شکستہ کشتی کی تقلید میں جو نہیں اس جزیرے تک لے آئی تھی، ایک کشتی بنائیں، اس خانہ ویران قافلے نے اور کچھ نہ کیا۔ ہاں کبھی کبھی ساحل کے قریب خارا کوئے کر دو ایک کشتی چلا کے مچھلیاں پکڑ لایا کرتے تھے۔

ایک رات جب کہ چاندنی کھلی ہوئی تھی اور جزیرے میں خاموشی طاری تھی، خارا آلات حرب اور بہت سا خورو نوش کا سامان لے کر جزیرۂ خارستان کو "خدا حافظ" کہہ کر کشتی میں بیٹھ سمندر سے مقابلے کے لئے چپکے سے نکل کھڑا ہوا۔

اور اپنے دل میں کہنے لگا "موت؟ آخر کیوں؟ کس لئے؟ کوئی وجہ نہیں، ہرچہ بادا باد، اس یکساں زندگی سے نجات تو ملے گی" یہ کہہ کہہ کے کبھی کشتی کھیتا، کبھی چھوڑ دیتا کہ کشتی اپنے آپ چلے

پو پھٹتے ہی اُس کی آنکھوں کو (جو رات کی بے خوابی سے بے تاب اور مخمور تھیں) دُور بہت، بہت دُور ایک نقطہ سا نظر آیا اور ملاح نے یہ اُمید کر کے کہ شاید یہ وہی ارضِ موعود ہے جس کے لئے اس کا دل و جان بے تاب ہے۔ خوشی خوشی کشتی کو اس کی طرف لے جانا شروع کیا اور شام تک اپنی پوری کوشش اس میں صرف کرتا رہا، وہ اس قدر محو تھا کہ اُسے نہ معلوم ہوا کہ تھکن کیا چیز ہے، نیند کیا شے ہے، بلکہ اپنے آپ اس کی طبیعت نے ایک گانا بنایا جسے وہ شوق سے گاتا رہا۔

"سُنتا ہوں نگری نیکی ہے اور سُندر ہے سنسار
ناؤ تو چلیو پار، نیّا تو لگیو پار"

رات آدھی گزر چکی ہوگی کہ یکایک ایک بلبل کی نرم و نازک و شیریں آواز جسے عمر بھر میں اُس نے کبھی نہ سُنا تھا اُس کے کانوں میں آئی۔ اس آواز کے نشے سے مست ہو کر اُس نے کشتی چلانی بند کر دی اور بے حس و حرکت بیٹھ کر اُسے سُننا شروع کیا۔ زمردین ٹیلوں سے، بوئے گل اور نوائے بلبل،

نسیم کے جھونکوں کے ساتھ ساحل تک آ رہی تھی اور مستی اور خوشی پھیلا رہی تھی۔

اگرچہ چاندنی رات تھی، لیکن آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے چاروں طرف کی چیزیں صاف نظر نہ آتی تھیں۔ خارا اس خفیف تاریکی میں اس غیر معمولی حالت، اس راحت رُوح نغمہ و خوشبو کو بچّوں کی طرح ہمک کے لینا چاہتا تھا، لیکن ان سب سے مست ہو کر آنکھیں اور ہونٹ کھولے، سر پیچھے کو ڈالے کشتی میں پڑا تھا اس کے کان جو درندے حیوانوں کی پُرہول آوازوں سے آشنا تھے، اب بُلبل کا ترانہ سُن رہے تھے، اس کا جسم جو کانٹوں اور پتھروں سے چھدا اور چھلا کرتا تھا، پھولوں کی خوشبوئیں اُس جسم کو آ آ کر لپٹ رہی تھیں اور اس پر ایک پُرلطف اور اشتیاق انگیز سُستی طاری ہو رہی تھی۔ خارا اِس قدر دل شاد تھا اور ایسا لطف اُٹھا رہا تھا کہ اس خوف سے کہ اس میں خلل نہ پڑ جائے کشتی میں ذرا نہ ہلتا تھا۔

جس وقت صبح ہوئی اور گرد و نہ گلگونۂ آفتاب، اپنے مطلع

احتشام سے نکل کر آہستہ آہستہ اوپر کو بڑھا، اس وقت درختوں کے سبز پتّے اور رنگ برنگ کے پھول چمک اُٹھے اور پتّوں پر قطرات شبنم موتی بن گئے۔ خارا اس سے بے خبر کہ کہاں آیا ہوں اور اس سے غافل کہ کیا دیکھ رہا ہوں متحیّر نظریں چاروں طرف ڈال رہا تھا۔ اتنے میں درختوں کے پیچھے سے ایک گردباد اُٹھی اور قہقہہ اور زمزمہ کے ساتھ خارا کی طرف بڑھتی نظر آئی۔

نوجوان خارا، جواب تک نہیں جانتا تھا کہ ڈر کیا چیز ہے، اس وقت ایک خلجان اور گھبراہٹ سے کانپنے لگا اور ہر احتمال کے مقابلے کے لئے تیاری کرنے لگا۔

یہ صرصر رنگ وسحاب، آہستہ آہستہ خارا جہاں کھڑا تھا اُس سے کچھ فاصلے پر سمندر کے کنارے آکر رُک گئی اور جب خاک چھٹی تو اُس میں سے ایک جسم منوّر ظاہر ہوا۔ خارا پہلی نظر میں نہ سمجھ سکا کہ آیا آفتاب زمین پر اُتر آیا ہے یا مَیں آسمان پر ہوں یہ سوچے بغیر کہ کیا کرنا چاہیئے وہ اپنی کشتی سے نکلا اور حسب معمول اُسی "ہاؤ" کے ساتھ اُس نے اُس پر حملہ کیا کہ یکایک ایک تیر نے

سامنے سے آکر خارا کو زخمی کر دیا۔

نسرین نوش اپنا دل بہلانے کے لئے، اکثر اپنی ماں سے اجازت لے کر شکار کو نکلا کرتی تھی، اس صبح کو اپنی سہیلیاں پیچھے چھوڑ کر وہ بہت آگے نکل گئی تھی اور آخر کار تھک کر ساحل تک شکار اور غُسل کے لئے آئی تھی۔

خارا جیسے مجہول اور غیر معلوم شکار کو دیکھ کر اُس نے فوراً اس پر تیر چھوڑا تھا جس سے یہ شکار زخمی تو ہوا لیکن نسرین نوش نے دیکھا کہ زخم کھا کے وہ اس کی طرف جھپٹا اور قبل اس کے کہ دوسرا تیر چھوڑے اُس نے اپنے تئیں شکار کی آغوش میں پایا اور شکار اور شکار کرنے والی کی نظریں، ایک آتش ریز حرارت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں۔ نسرین نوش سمجھتی تھی خارا کوئی نیا شکار ہے خارا سمجھتا تھا، نسرین نوش کوئی شکار کرنے والی چڑیا ہے۔ مگر نہ معلوم کیا بات تھی اور کیا سبب تھا، ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیوں اُن کی نظروں میں ایک دوسرے کے لئے کشش تھی۔ دونوں کے دلوں میں گھبراہٹ تھی، جانے کیسے، خارا کی فریاد سے نسرین نوش

اور نسترین نوش کی پُر خلجان مسکراہٹ سے خارا نے سمجھ لیا کہ ہم ہمجنس ہیں۔ نسترین نوش کا نرم ریشمی لباس بارہ سنگھے کی کھال کے کپڑوں میں جسے خارا پہنے ہوئے تھا پھنس گیا، دونوں نے اُسے چھٹانا چاہا، مگر دیکھتے کیا ہیں، کہ ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں ہے اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو محبّت سے دبا رہا ہے۔

خارا نے اپنے اوپر جو نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ تیر کے زخم سے خُون نکل رہا ہے، کچھ اس تردّد سے کچھ نہ معلوم کیوں، خارا نے اپنے کُل ہتھیار زمین پر ڈال دیئے۔ نسترین نوش کے ہاتھ سے بھی حیرت کی وجہ سے تیر گر پڑے۔ اب ان دونوں میں اپنے آپ، ایک بے تکلّف، بے مراسم، مگر اسرار انگیز آمیزشِ نہانی پیدا ہو گئی نسترین نوش اس سے پوچھ رہی تھی: "تو کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے" اور خارا اشاروں سے سمجھا رہا تھا: "دُور سے آیا ہوں، کانٹوں سے پتّھروں سے آ رہا ہوں" ہاتھوں کے ملنے سے نوجوان خارا کے جسم میں ایک عجیب برقی حرارت سرایت کر گئی تھی، جس کی وجہ سے وہ کانپ رہا تھا۔ ادھر خون نکلنے کی وجہ

سے، اس کے چہرے کا رنگ اُڑا جا رہا تھا۔

نسرین نوش نے آہستہ آہستہ تیر، خارا کے پہلو سے نکالا۔ خون کو اپنے کپڑے سے پونچھا، اور زخم دھویا، پھر جا کے قریب سے چند پتّے لا کے زخم پر باندھے۔ انہیں باندھتے وقت نسرین نوش جو خارا پر جھکی تو ایک مرتبہ پھر اُن دونوں کی نظریں، نظریں کیا، ان دونوں کی رُوحیں، ایک مبہم شوق کے ساتھ، ایک دوسرے سے ملیں، اور اس دفعہ دونوں کی آنکھوں میں سے ایک جاں فروز چمک، ایک دلسوز چنگاری نکلی، موجیں ساحل کی طرف کیسے آتی ہیں؟ آفتاب کائنات پر کس طرح روشنی ڈالتا ہے؟ شہد کی مکھّی کس طرح پھولوں کی طرف جاتی ہے؟ بس بالکل اسی طرح، ان دو یگانۂ رُوح آشنا کے ہونٹ، ایک قدرتی کشش، ایک قدرتی شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے۔

یہ جزیرہ گو بے انتہا خوبصورت تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک گراں خواب میں سو رہا ہے، اور ہمیشہ سے کسی چیز کا انتظار کر رہا ہے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کا بوسہ لینا تھا کہ جزیرے

کے پرند، چہچہا کر اُڑنے لگے، تمام کلیاں ایک دم کھِل گئیں۔ ایک گرد باد آہنگ و رنگ، ایک زمزمۂ جوش و خروش نے گُل جزیرے کو گھیر لیا اس وقت دونوں (خارا و نسرین نوش) مدہوش اور بے خبر پڑے ہوئے تھے۔ خارا کو ایک ایسی خوشی حاصل ہو رہی تھی جو اُس نے تمام عمر میں اب تک محسوس نہیں کی تھی اور اس نشے کی لذّت سے، اُس کی آنکھوں کی پُتلیاں پھیل رہی تھیں، آغوش کھُلی ہوئی تھی، سینہ سانس کی وجہ سے اُبھر رہا تھا اور دل ایک ننّھی چڑیا کی اُڑان کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

پہلے نسرین نوش ہوش میں آئی تو دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر جہاں خارا نے بوسہ لیا تھا ایک پھول کھِلا ہوا تھا، یہ کیا؟ اُس نے سوچا تو یاد آیا کہ ایک مرتبہ، جب وہ سو نہیں رہی تھی، بلکہ آنکھیں بند کئے تھی اور اس کی ماں حسب معمول اُسے دیکھنے آئی تھی، تو اُس نے کہا تھا: "خدا نہ کرے، مجھے خبر ہوئے بغیر، یہاں کوئی مرد آئے لیکن اگر آیا تو مجھے معلوم ہو جائے گا، کیونکہ اگر اُس نے میری بیٹی کا بوسہ لیا تو بوسے کی جگہ پھول کھلیں گے اور اس سے مجھے

پنا لگ جائے گا۔" ماں کی یہ تقریر جب نسرین نوش کو یاد آئی، تو وہ گھبرائی، ایں یہ تو مرد ہے! یہ وہ چیز ہے جس سے میری ماں مجھے بچانا چاہتی تھی، اب کیا کروں؟ یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔ بڑی بُرائی ہوئی، مگر بُرائی کہتے وقت دل کہتا تھا: "اگر بُرائی ہے تو شیریں اور پُر لطف بُرائی ہے۔"

اب نسرین نوش ہزار طرح سے خارا کو سمجھانا چاہتی ہے کہ "ماں آئے گی تو تجھ پر بہت خفا ہو گی، جا، جہاں سے آیا ہے، وہاں بھاگ جا" لیکن خارا، نہ سمجھتا تھا، نہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ آخر عاجز ہو کر نسرین نوش رونے لگی اور آنسو اُس کے سُرخ رخساروں سے ڈھلک کے، زمین پر گرنے لگے۔ یہ آنسو گرتے ہی موتی بن جاتے تھے۔

خارا اس رونے سے بھی کچھ نہ سمجھا، بلکہ پہلی لذت کا جو اثر دماغ میں بسا ہوا تھا، اس سے متاثر ہو کر، پہلے جوش واشتیاق کے ساتھ نسرین نوش کو آغوش میں لے کر، اُن رونے والی آنسوؤں سے تر آنکھوں کو چومنے لگا اور جب نسرین نوش نے

اپنے ہاتھوں سے، اُسے اپنے پاس سے ہٹانا چاہا، تو خارا نے، ہاتھوں ہی کو پکڑ کے چُومنا شروع کر دیا۔

نسرین نوش، اس وحشی مگر فسوں کار موناز دہ مرد کی آغوش سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہی تھی کہ دُور سے اُس کی ماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ماں، جو مرد کو سب سے بڑی مصیبت خیال کرتی تھی، وہ ماں جو رات دن اسی دُھن میں رہتی تھی کہ مرد کا گزر اس جزیرے میں نہ ہو، اب مرد کے روبرو تھی، اس کش مکش میں، اور نیز اپنی ماں کو آتا دیکھ کر، نسرین نوش، گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی۔ خارا نہیں جانتا تھا، کہ بے ہوش ہونا کیا چیز ہے، اس لئے اس نے اس بیہوشی کو ایک ادائے تسلیمیت خیال کیا، اور نسرین نوش کے پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں سے لے کر، پاؤں تک لگاتار بوسے لینے شروع کر دیئے اور سر سے پاؤں تک جہاں جہاں بوسے لئے تھے، وہاں پھُول کھل گئے، یہاں تک کہ نسرین نوش کے جسم پر کوئی جگہ خالی باقی نہ تھی جہاں پھول نہ کھلے ہوں۔ نسرین نوش کی ماں کے خارا تک پہنچتے پہنچتے

نسرین نوش ایک گلدستۂ لطیف بن گئی!

بُڑھیا، اپنی بھویں اُٹھا اُٹھا کے، خارا سے اس جزیرے میں آنے کا سبب پوچھتی تھی، مگر خارا نہ سمجھتا تھا، نہ سمجھنا چاہتا تھا۔ بس اپنے ہاتھوں میں کے گلدستے کو دکھاتا تھا اور اپنی آغوش میں لے کر بھینچتا تھا، بڑھیا نے خیال کیا کہ "بہتر یہی ہے کہ اسے جزیرے سے نکال دوں، کیوں کہ میں اس کا مقابلہ تو کر نہیں سکتی۔" یہ سوچ کر اُس نے اپنی جریب سے اشارہ کیا:

"جا اس جزیرے سے نکل جا۔"

خارا فوراً گلدستے کو اپنی گود میں اُٹھا کر، کشتی میں جا بیٹھا۔ نسرین نوش اب تک بیہوش تھی۔ اس دفعہ ہوا اور موجوں نے خارا کی کشتی کی مدد کی اور وہ بہت جلد جزیرۂ خارستان کو پہنچ گیا، جزیرے کے کنارے، اس کے تمام ساتھی پریشان، مضطرب، منتظر بیٹھے تھے۔ خارا اپنے مالِ غنیمت، یعنی اس گلدستۂ رُوح و راحت کو لے کر کنارے پر آیا، تو اس کے تمام ساتھیوں نے جو مدت سے ان پھولوں کی خوشبو سے محروم

تھے بہ کمالِ ادب و احترام اس گلدستے کی خوشبو سے اپنی مشام جان کو معطر کرنا شروع کیا۔ جب خارا نے اپنی سرگذشت سنائی تو ساتھیوں نے تحسین اور حیرت بھری نگاہیں اس پر ڈالیں اور سب سوچنے لگے کہ زندگی کی بڑی کمی کو پورا کرنے والی یہ چیز، یہ لازمۂ عمر یعنی یہ عورت کس طرح ہوش میں لائی جائے۔

آخر سب نے کہا کہ بڈھے کے پاس (جو غار میں تھا، ساحل تک نہیں آیا تھا) لے چلنا چاہیئے، وہ کوئی ترکیب بتائیگا۔ بڈھے نے تمام حال کو سُنا اور خوشی خوشی اپنے تمام تجربوں سے جو ہندوستان و سرندیپ میں اُسے حاصل ہوئے تھے، نسرین نوش کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ دوائیں دیں، منتر پڑھے، پانی چھڑکا، یہاں تک کہ صبح ہوئی اور آفتابِ عالمتاب، دُنیا کو حرارت اور زندگی دیتا ہوا، نمودار ہوا اور اُس وقت نسرین نوش کے جسم کے پھُول، ایک ایک کر کے زمین پر گر پڑے اور یہ عورت، اپنے تمام عورت پن، اپنی تمام نسوانیت اپنی تمام شفقت، اپنی تمام شعریت کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اب نسرین نوش اپنے تئیں خارا کے قوی بازوؤں، پُرجوش

سینے ہیں، پانے سے بہت خوش تھی، اور ایک نسوانی غرور کی ادا سے چاروں طرف دیکھتی تھی اور ہنستی تھی - اس کے ہنستے ہی اس خشک جزیرے کے پہاڑ اور گھاٹیاں سبز ہوگئیں - سیاہ غمناک کانٹے، پھول اور سنبل بن گئے - اور عورت کی جادو بھری نظر اور نیم خندۂ سحر نے اس مصیبت زدہ طائفہ کو جو مدّت سے شفقت کے لئے ترس رہا تھا، جانِ تازہ بخش دی اور یہ لوگ اُن عذابوں کو جو اُنہوں نے اُٹھائے تھے آن کی آن میں بھول گئے -

ہیرے، موتی، زمرد، لعل، یاقوت، فیروزے وغیرہ جو اس جزیرے میں پڑے ہوئے تھے، اور کوئی اُن کی بات نہ پوچھتا تھا، اب جمع کرکے لائے گئے اور نسرین نوش کے قدموں پر ڈال دیئے گئے - اس حُسن و آن کو دیکھ کر بڈھا مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا، اور سر ہلا ہلا کر کہتا تھا "ہاں! محبت پاش، سودا ریز بال نہ ہوں، جن میں ہیرے لگائے جائیں تو ہیروں کی کیا قدر ہوسکتی ہے اور اگر نازک اُنگلیاں نہ ہوں تو یاقوتوں سے، زمردوں سے اور پیاری گوری گردنیں نہ ہوں، تو موتیوں کے وجود سے کیا فائدہ!"

بڈھا مارے خوشی کے متوالا سا ہو گیا تھا، کچھ چپ ہو جاتا، لیکن ترنگ میں آکر پھر کہنا شروع کرتا:-

"عورت! عورت عورت! ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کر اُسے تازگی، اُسے زینت بخش دیتی ہے۔ وہ ایک دُھونی ہے کہ محبّت کی لپٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔ بغیر عورت کے مرد سخت دل ہو جاتا ہے، اکھل کھرا بن جاتا ہے، یہ عورت کی شفقت و نوازش، یہ اُس کی مسکراہٹ کا ہی اثر ہے کہ مردوں کا سینہ عالی اور رقیق حیات سے منور ہو جاتا ہے"

اب نسرین نوش کو ایک دست قوت مل گیا تھا، جو اُسے آغوش میں لے اور خارا کو ایک دست شفقت ہاتھ لگ گیا تھا جو مبارزۂ حیات کی اذیّتوں کو بھلا دے۔

بڈھا اس جوڑے کو دیکھ کر وفور مسرت سے چپ نہ رہ سکتا، ناچنے لگتا پھر کہتا:-

"عورت میں حسن نہ ہوتا، تو مرد میں جرأت اور عالی حوصلگی نہ ہوتی مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی، تو عورت کی خوبصورتی و دلبری رائگاں جاتی ہے

الحمد لمن قدّر خیراً و خیالاً   و الشکر لمن صوّر حسنا و جمالاً

ازدواجِ محبّت

بچھڑے دوستوں سے بھی مل کے کیسی خوشی ہوتی ہے! بس خود آپ ہی اندازہ کر لیجئے۔ آخر کار آپ کا بھی تو کوئی دوست بچھڑ گیا ہوگا۔ اور پھر آپ سے اچانک آملا ہوگا۔ آپ ہی فرمائیے کیا شادیِ مرگ کا خوف نہیں ہو جاتا۔ میری بھی واللہ، ایک ہفتہ ہوا یہی کیفیت ہوئی۔ اتفاق سے ایک کام کے باعث میرا جانا علی گڑھ ہوگیا۔ مَیں کالج کے دیکھنے کا عرصہ سے مشتاق تو تھا ہی، اس موقعے کو غنیمت جانا اور ایک زائر کی حیثیت سے کالج کے احاطہ میں قدم رکھا۔ پہلے سرسیّد مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھا۔ پھر کالج کی سیر میں مصروف ہوا۔ ہر چیز کو عظمت اور محبّت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور جس عمارت پر نظر پڑ جاتی اُس میں محو ہو جاتا تھا۔ اس استغراق کی حالت میں اک نظر اک صاحب پر بھی جا پڑی۔ جو میری طرح محوِ نظارہ تھے۔ مَیں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک کوئی

ایسی ہی خاص کشش نہ ہوتی میں کالج سے آنکھ تھوڑا ہی اُٹھانے والا تھا۔ لیکن ان پر نظر پڑنی تھی کہ میں اپنے گردو پیش کی کُل چیزوں کو بھُول گیا اور بیتابانہ ان سے جاکر لپٹ گیا۔ اوّل تو وہ جھجکے، لیکن پھر ایک استعجاب آمیز "تم کہاں؟" کہہ کے مجھ سے لپٹ گئے۔ اصلیت یہ تھی کہ ہم دونوں بچھڑے ہوئے کم وبیش تیرہ چودہ برس کے بعد ملے تھے۔ میں اس بات کو طول نہ دونگا کہ ہم دونوں کیسے جدا ہوئے تھے اور میں ان تیرہ چودہ برس میں کہاں کہاں رہا۔ مختصر یہ ہے کہ مجھ میں اور میرے دوست محمد نعیم میں بعد المشرقین رہا۔ اور ہم اس زمانے میں ایک دوسرے کے حالات سے بالکل بے خبر رہے۔ میں برہما میں تھا۔ تو وہ انگلستان میں، اور وہ بھی ایک زائر بن کر علی گڑھ آئے تھے۔ محمد نعیم کو دیکھتے ہی کالج کی سیر کچھ وقت کے لئے موقوف ہوئی اور ایک دوسرے کے حالات دریافت ہونے لگے۔

آخر کار ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن بعد ہمیں ایسٹ انڈین ریلوے کی ڈاک گاڑی عظیم آباد کی طرف لے جارہی تھی، جہاں میرے دوست ڈاکٹر نعیم ایم ڈی ایل آر سی پی (کیونکہ اب مجھے معلوم ہوا کہ

اس عرصہ میں محمد نعیم انگلستان جا کر ایم ڈی ہو آئے تھے) کا مکان ہے۔

عظیم آباد پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنی عالی شان اور بے نظیر کوٹھی میں اُتارا۔ اور اُسی روز آپ نے کُل احباب کی دعوت کی تاکہ مجھ سے ملائیں۔ دعوت کے بعد سب لوگ باہر چمن میں آ بیٹھے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر یکے بعد دیگرے سب رخصت ہو گئے اور ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔

چونکہ گرمی کا موسم تھا، اس لئے رات کا وقت و چاندنی صحن چمن اور ٹھنڈی ہوا ایسی چیزیں نہ تھیں کہ ہم میں سے کسی کا دل اُٹھنے کو چاہتا۔ باہر ہی کرسیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر آ گیا کہ انسان کی زندگی میں ایسے دلچسپ واقعات نہیں ہوتے جن میں ناول کا مزہ آئے، مَیں اس بارے میں بہت بھرا بیٹھا تھا۔ مَیں نے ناول نویسوں پر نہایت بے دے شروع کی کہ "کم بخت ایسی ایسی باتیں لکھتے ہیں کہ ہمیں رشک ہوتا ہے کہ ہماری زندگی میں کیوں ایسے واقعات پیش نہیں آتے"۔ اور کیا اور کیا بہت ہی کچھ کہہ ڈالا۔ نعیم چُپکا سُنا کیا، صرف ایک آدھ جگہ مُسکرایا، مجھے حیرت

تھی کہ یہ کیوں اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے۔ خیر جب میں سب کچھ کہہ چکا تو نعیم نے ایک اور مضمون پیش کیا۔ کہنے لگے :۔

"آج کل پردے کی بحث چھڑی ہوئی ہے تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ جدید خیال ہو یا کہنہ خیال ؟ کہنہ خیال ہو گے، کیونکہ پردے کی مخالفت تو تم سے قیامت تک بھی نہیں ہونے کی۔"

میں نے کہا: "بے شک پردے کی مخالفت کون صاحب عقل کر سکتا ہے۔"

"تو پھر یہ شکایت بھی چھوڑ دیجئے کہ ہماری زندگی میں دلچسپی نہیں"

"اس کو پردے سے کیا تعلق ؟"

"ایں تعلق ہی نہیں! جب تک پردہ ہے، عشقیہ شادی جس کے آپ اس قدر دل دادہ معلوم ہوتے ہیں ممکن ہی نہیں۔ وہاں تو یہ ہوتا ہے کہ بڑھے تو ماں باپ نے جہاں اُن کا دل چاہا، بیاہ دیا چُون وچرا کی گنجائش ہی نہیں اور ہو بھی تو کیا نہ دیکھ سکتے ہیں نہ بات کر سکتے ہیں۔ شادی کیا ہوئی سرکاری نوکری ہوئی جہاں سرکار کا دل چاہا، نوکر کو بھیج دیا۔ حاکم کو ماتحت کی خبر نہیں، ماتحت

کو یہ معلوم نہیں کہ حاکم کیسا ملے گا۔ اس زندگی میں رازِ سربستہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں اور افسانوں کا سلسلۂ راز آخر میں جا کر کھل کیسے سکتا ہے؟ یہ سب سچے عشق کی طفیل میں نصیب ہو سکتا ہے روپیہ کے لئے شادی مت کیجئے، بلکہ عشق کے لئے اور پھر میرا دعویٰ ہے کہ ایک ایک لفظ ناولوں کا آپ کو صحیح معلوم ہو گا۔ لیجئے میری ہی سرگذشت سُنئے اور بتائیے کیا یہ ناول نہیں؟"

یہاں نعیم یکایک رُک گیا، کچھ دیر تک متاثر حالت میں سگار کے دھوئیں کو دیکھا کیا، گویا نظر وہاں ہے اور خیال کہیں اور پھر کہنے لگا:۔

"کیا اس سے بھی بڑھ کے کوئی افسانہ ہو سکتا ہے"

مَیں نے بڑے اشتیاق سے کہا:۔

"خدا کے لئے سُنا دو"

"سُناؤں تو، مگر کیا میں سُنا سکوں گا؟"

میں نے ذرا چلّا کے کہا ۔

"للہ میرے اشتیاق کو مت بھڑکاؤ کہو تو"

"بھائی اصل یہ ہے کہ یہ سرگزشت ایسی نہیں (نعیم کی آواز یہاں رقّت بھری تھی) کہ مَیں ٹھنڈے دل سے بیان کر سکوں مجھے معاف کرنا اگر کہیں وارفتگی کی حالت طاری ہو جائے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب ہم تم کالج میں پڑھا کرتے تھے تو مَیں ہمیشہ ولایت جانے کی تمنّا ظاہر کیا کرتا تھا۔ جب تم کالج چھوڑ کے چلے گئے۔ اُس کے کچھ دنوں بعد والد مرحوم مجھے ولایت بھیجنے پر راضی ہو گئے۔ حیدرآباد میں تو نوکر تھے ہی وہاں کوشش کر کے ریاست کی طرف سے مجھے بھجوایا۔ پانچ برس کی محنت شاقہ کے بعد، بفضل خدا مَیں ایم ڈی ہو کر واپس آگیا اور ریاست میں سول سرجن مقرر کیا گیا۔ اس کے ایک سال بعد ہی والد ماجد کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ والد مرحوم کی تمنّا یہ تھی کہ میری شادی اُن کی زندگی ہی میں ہو جاتی، مگر ہائے ایسے باپ کسے نصیب ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے کبھی مجھ پر جبر نہیں کیا، اور اس کو میری مرضی پہ چھوڑ دیا۔ شادی کے بارے میں میرے خیالات اُس وقت کچھ اور ہی تھے۔ اور میں اُن پر ہنستا تھا جو خواہ مخواہ شادی کر کے مصیبت میں پڑتے تھے اور اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھتے

تھے۔ میں کہتا تھا کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ جان بوجھ کر انسان اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈال لے۔ کیا معلوم تھا کہ تھوڑے دنوں بعد لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔ جو شفاخانے میری زیر نگرانی تھے، اُن میں سے تین چار زنانے شفاخانے بھی تھے اور یہ نہایت حیرت انگیز بات تھی کہ ان میں کی ایک ڈاکٹرنی مسلمان تھی لاہور میں تعلیم پائی تھی اور حیدرآباد مقرر ہو کر آئی تھی۔ چوں کہ یہ بالکل ایک نئی بات تھی اس لئے حیدرآباد میں اس مسلمان لیڈی ڈاکٹر کا شُہرہ تھا۔ ہندوستانیوں کی بدگمانی! آپ جانیں یہ کسی کے حق میں کلمۂ خیر تھوڑا ہی کہیں گے۔ کسی کو اس کی پاک دامنی میں شُبہ تھا، کوئی کہتا تھا جانے کس رذیل قوم کی ہے۔ غرض کہ جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں تھیں۔ لیکن اس کا حُسن سب کو خیرہ کیئے ہوئے تھا، کیونکہ وہ پردہ بالکل نہیں کرتی تھی، مجھ کو اپنے عہدے کی حیثیت سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا، مگر اس رکھ رکھاؤ کی عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ چاہے اسے مزاج کی سنجیدگی کہئے، یا غُرورِ حُسن خیال کیجئے، کچھ ہو، نتیجہ یہ تھا کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ آنکھ بھر کر

دیکھ سکے۔ کام اتنا عمدہ کہ کُل ریاست کے زنانہ شفاخانوں میں اُس کا شفاخانہ اوّل رہتا تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ اگر کوئی کہیں اُس کی ذرا سی بھی بُرائی کرتا تو مجھے تاب نہ رہتی تھی میں کہتا کہ یہ پہلی مثال ہے کہ اک مسلمان عورت نے ڈاکٹری امتحان پاس کیا اور وہ پہلی مثال بھی اتنی عمدہ ہے، پھر بھی اُسے بُرا کہا جاتا ہے۔ غرض کہ میں لوگوں سے اُس کی حمایت میں لڑا کرتا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ مجھے محض اس سے محبّت ہی نہیں، عشق ہے، کیونکہ روز بروز اُس کا خیال دل میں گھر کرتا جاتا تھا۔ اس خیال کو جتنا میں نے ہٹانا چاہا، اُتنے ہی زیادہ زور سے وہ دل میں متمکن ہوتا گیا۔ میں اپنے دل سے کہتا تھا کہ: "دُنیا کیا کہے گی، عزیز و اقارب کیا کہیں گے" دل کہتا تھا کہ عشق میں ان باتوں کا کیا خیال؟ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ شریف ہے، نیک ہے، لاکھوں میں انتخاب ہے۔ جب خدا اور رسُول نہیں روکتے تو اور روکنے والا کون ہوتا ہے۔" میں انہیں خیالات میں مستغرق رہتا تھا اور کوئی تصفیہ نہیں کرسکتا تھا کہ مجھے معلوم نہیں کس طرح اور کس بے خودی کی حالت میں ایک دن میں

اس سے یہ کہا گیا کہ :

"آپ کی شادی ہو گئی ہے اور اگر نہیں تو کیا آپ کی زوجیت کی عزّت مجھے حاصل ہو سکتی ہے؟"

اُف! اس فقرے کا اثر اُس پر کیسا ہوا ہے؟ چہرہ یکایک تمتما اُٹھا، آنکھیں جو حسیاتِ رُوح کی بے زبان ترجمان ہیں، پُرغضب ہو گئیں اور نہایت غصّہ بھری آواز سے اُس نے مجھے جواب دیا۔

"جناب! مَیں نہیں جانتی آپ کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ آپ میرے افسر ہیں، مجھے آپ سے اس قسم کی باتوں کی اُمید نہ تھی۔"

بجائے اس کے کہ مَیں اس جواب سے اپنے ہوش میں آتا، نہ معلوم وہ کیا بات تھی کہ جس نے مجھے اور بے خود کر دیا اور بیتاب ہو کر نہایت عاجزی سے التجا کرنے لگا۔ اُس دن مجھے یقین ہوا ہے کہ

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا میشود
گر نسوزد شمع کے پروانہ شید امیشود

جب مَیں اپنی جنون آمیز گفتگو ختم کر چکا تو مجھے یقین تھا کہ شاید اس وقت عتاب کی انتہا نہ رہے گی، لیکن میرے نصیب کہ اُس نے

نہایت آہستگی سے کہا:

"خود آپ خیال کیجئے کہ میں ایک معمولی درجے کی عورت ہوں آپ اللہ رکھے، اتنے بڑے عہدے پر ہیں کہاں میں، کہاں آپ، مجھے یقین ہے کہ جب آپ اپنی کوٹھی پر جائیں گے تو آپ کہیں گے کہ لاحول ولاقوۃ مجھ سے بھی کیا بیہودگی ہوئی ہے۔ ایک ادنیٰ درجے کی عورت سے کیا کیا باتیں کہی ہیں، اس لئے مجھے میرے حال پر رہنے دیجئے"۔

یہ جواب شاید تمہارے نزدیک مایوسی دلانے والا ہو، مگر مجھ پر تو اُس نے اُلٹا اثر کیا۔ میں گھر گیا تو ان خیالات میں کچھ ایسی اُلٹا میں کسی کام کے قابل نہ رہا۔ اُٹھتے بیٹھتے، یہی دُھن تھی کہ وہ کسی طرح میری التجا کو قبول کرے۔ میری یہ حالت کہ ضرورت ہو یا نہ ہو، اُس کے شفاخانے کا معائنہ ضرور کرنا، اور کسی نہ کسی طرح عرض حال کرنا، کچھ عرصہ کے بعد میں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ اُس کی پہلی بھڑک میں بھی کمی ہوتی گئی اور قصّے کو طول کیا دوں ایک دن وہ آیا کہ میں اور وہ دُولہا اور دُلھن ہو گئے۔ لیکن میری اور

قمرالنساء (یہ اس کا نام تھا) کی شادی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ حیدرآباد بھر میں اس کا چرچا ہوا۔ اگرچہ ہم نے سادے طور پر شادی کی تھی مگر اپنی اپنی قسمت ہے کوئی ہزاروں روپیہ خرچ کرتا ہے اور دھوم دھڑکے سے بیاہ رچاتا ہے، تاہم شہرت اُس کی عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتی جو ہماری غریبی کی شادی کی ہوئی۔ مگر جو سُنتا تھا کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا، ہم پر لعن طعن کرتا تھا۔ ہم عیش سے زندگی بسر کرتے تھے، کیا خبر تھی کہ ہم پر یُوں ظلم ہوگا ؎

ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

دشمنوں نے ہمارے افسرِ بالا کے کان بھرے اور ایک دن مرگِ مفاجات کی طرح ہمارے پاس یہ حکم آیا کہ دونوں حدودِ ریاست سے باہر ۲۴ گھنٹے میں نکل جائیں۔ ہم کر ہی کیا سکتے تھے۔ سنگ آمد و سخت آمد ہم اپنے قلیل التعداد ہمدردوں کی افسوس اور ٹڈی دَل دشمنوں کی خوشیوں میں حیدرآباد سے رخصت ہوئے۔ قمرالنسا نے مجھ سے آبدیدہ ہو کر کہا: ”دیکھا! میری وجہ سے تم پر یہ مصیبت نازل

ہوئی"۔ لیکن مجھے بخداء، ذرا بھی جو اس کا خیال ہو کہ مجھ پر یہ مصیبت ہے، مَیں اپنے تئیں دُنیا میں سب سے بڑا خوش قسمت سمجھتا تھا کیونکہ میری قمرالنساء میرے ساتھ تھی۔ مَیں حیدرآباد سے سیدھا لکھنؤ پہنچا اور یہاں مَیں نے اپنا مطب جاری کر دیا۔ سچ کہا ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ حیدرآباد سے یُوں نکلا، یہاں پہنچ کے بالکل ناامیدی ہو گئی۔ کئی مہینے گزُر گئے اور آمدنی عنقا! اور ایک دم چلتی بھی کس کی ہے؟ یہ تو ایک سوداگری ہے۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ جب تک نہ ہو کون آتا ہے؟ اور میرے پاس کیا تھا؟ جب حیدرآباد میں رہا کبھی کچھ پس انداز ہی نہ کیا، جس کا خمیازہ اب بھُگتنا پڑا۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر کہنا ہی پڑتا ہے یہ حالت ہو گئی تھی کہ ایک ماما تک رکھنے کی مقدرت نہ رہی۔ قمرالنساء بیچاری سارے کام گھر کے کرتی تھی اور جب مَیں گھر میں آتا تو نہایت خندہ پیشانی سے کہتی کہ:۔

"کھانا پکانا اور گھر کا کام کرنا مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے"۔

اُس کا یہ کہنا گو وہ دل سے ہی ہوتا تھا، مجھ پر تیر کا کام کرتا تھا مَیں کہتا تھا کہ: "ہائے مَیں کمبخت ہی تو اس بیچاری پر ان مصیبتوں

کے پڑنے کا باعث ہوا ہوں۔"

خدا کی شان، اسی زمانے میں قمرالنساء اُمید سے ہو گئی اب تو مجھے بے حد فکر ہو گئی۔ ہر وقت یہ خیال کہ ایسے ایسے سخت کام کرتی ہے۔ کہیں جھٹکا وٹکا آجائے تو اور مشکل آپڑے۔ اسی فکر میں رات دن گھلتا تھا اور کچھ کر نہ سکتا تھا۔ میرا کوئی رشتہ دار بھی نہ تھا کہ جس کے ہاں جا پڑتا اور قمرالنساء بھی کہتی تھی کہ "میں یتیم اور بالکل بے والی وارث ہوں۔" لیکن ایک دن خود ہی اُس نے کہا کہ "پٹنہ میں میرے ایک دُور کے رشتہ دار ہیں، شاید وہ زندہ ہوں، چلو وہیں چلیں۔" مجھ کو اس بات کا خیال کرتے بھی شرم آتی تھی کہ میں اُن کے ہاں جا کے پڑوں گا، لیکن کیا کرتا، قمرالنساء کی جان بھی پیاری تھی۔ گیا، مگر بادل ناخواستہ۔ جب ہم پٹنہ پہنچے، تو قمرالنساء پتا پوچھتی ہوئی ایک نہایت معمولی درجے کے مکان میں مجھے لے گئی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر، ایک بزرگ صورت باہر آئے۔ قمرالنساء کو دیکھتے ہی متعجب ہوئے، پھر خوشی خوشی گھر میں لے گئے۔ گھر میں ایک بڑی بی تھیں، جو ہم دونوں پر صدقے

ہوئیں اور قمرالنساء سے کہنے لگیں کہ: "میری بھانجی! تمہیں تو ہم مُردہ خیال کر چکے تھے" دو تین دن میں یہاں رہا۔ ایک دن قمرالنساء کے خالو۔ ہمارے 'میزبان' نے مجھ سے کہا:۔

"یہاں ایک نواب صاحب ہیں، میں اُن کی سرکار میں نوکر ہوں چلئے آپ کو بھی اُن سے ملاؤں" پھر ایک نہایت عالی شان کوٹھی میں مجھے لے گئے اور گول کمرے میں بٹھائے کہا کہ "تم یہیں بیٹھے رہنا، میں ابھی آتا ہوں، نواب صاحب بھی اس وقت تشریف لائیں گے محل میں ہیں"

میں اکیلا بیٹھا رہا۔ کوٹھی کی ایک ایک چیز کو دیکھتا تھا اور عش عش کرتا تھا، لیکن اک بات سے حیرت تھی: ساری کوٹھی میں سناٹا تھا، میں اسی حالت میں تھا کہ یکایک سامنے کا دروازہ کھُلا اور شاہزادیوں کے لباس میں ملبوس ایک خاتون کمرے میں داخل ہوئی۔ میں جھجک کے چاہتا تھا کہ کمرے سے باہر نکل جاؤں اور اس خیال سے میں باہر کی طرف لپکا بھی کہ اُس خاتون نے کہا:۔

"پیارے نعیم" پھر کر جو غور سے دیکھتا ہوں تو میری پیاری قمرالنسا

بادشاہزادی بنی کھڑی ہے۔ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا:
"میں خواب دیکھ رہا ہوں یا میری آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں۔"
قمرالنسا نے ہنس کے کہا: "نہیں تم جاگتے ہو، اور میں ہی تمہاری قمرالنسا ہوں۔" اللہ اللہ مجھے تم پہچانتے بھی نہیں (پھر میری طرف بڑھ کے اور گلے میں باہیں ڈال کے) خدا کا شکر ہے کہ ہماری مصیبتیں دُور ہوئیں میرے پاس بڑی ریاست ہے اور ہم اب عمر بھر یہیں رہیں گے۔"
میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "تو تم نے حیدرآباد میں نوکری کیوں کی تھی؟" "سب بتاتی ہوں، بے صبر کیوں ہوئے جاتے ہو۔ میرے والد مرحوم، نہایت روشن خیال آدمی تھے، اُنہوں نے میری تعلیم نہایت اعلیٰ درجے کی کی تھی اور کہتے تھے کہ اولاد کو تعلیم دینا بس یہی والدین کا فرض ہے۔ سوائے میرے اُن کے کوئی اولاد نہ تھی، اور خدا کی مرضی یہ ہوئی کہ میرے بارھویں سال میں، اللہ بخشے ابّا کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ ساری جائداد کی میں ہی مالک ہوئی۔ میں نے اپنے سرپرست سے کہا کہ میں ڈاکٹری پڑھوں گی۔ چنانچہ میں لاہور بھیجی گئی، وہاں سے آئی تو بڑے بڑے گھرانوں سے میرے لئے پیغام آئے، مگر

مَیں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ جب تک کوئی مجھے صرف میرے لئے نہ بیاہے گا، مَیں کسی سے شادی نہ کروں گی۔ اِس لئے غریب بنی اور حیدر آباد گئی اور صدقے اُس کی کریمی کے کہ اللہ نے تم جیسا پیارا خاوند مجھے دیا، جس نے مجھے میری دولت کے لئے نہیں بیاہا، بلکہ صرف میرے لئے ساری دُنیا مجھے بُرا کہتی تھی، میری طرف سے بدگمان تھی، پھر بھی میرا بوسہ لے کر، تم نے مجھ سے شادی کی اور مَیں نے تمہارے ساتھ ساری مصیبتیں جھیلیں، صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا تمہیں مجھ سے اصلی محبّت ہے یا اُکتا جاؤ گے۔ اپنی کوٹھی پر مَیں برابر حالات لکھتی رہتی تھی، اس وجہ سے خالو کو سب حال معلوم تھا۔

اس کے بعد ہم ہنسی خوشی رہنے لگے۔

یہ کہہ کے نعیم رُکا اور پھر بھرّائی ہوئی آواز سے کہنے لگا: مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے۔ آٹھ سال بعد، اللہ نے قمرالنساء بھی مجھ سے چھین لی۔ اب وہ جنّت میں ہے اور مَیں یہاں زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ ایک اُس کی یادگار ہے اور وہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ یعنی میری پیاری بیٹی نجم النساء جو ہمارے پٹنے آنے کے پانچ مہینے بعد

دُنیا میں آئی تھی۔ اللہ اُسے جیتا رکھے۔ میری ملبابت بھی یہاں خوب چمکی
اور اب میری ذاتی جائداد بہت کچھ ہے۔ اِس لئے میرا ارادہ ہے
کہ قمر النساء کی جائداد کسی کارِ خیر کے لئے وقف کر دوں۔
عزم یہ ہے کہ کُل جائداد عورتوں کی تعلیم کے واسطے وقف کر دوں۔
جب محمڈن یونیورسٹی بنے تو ایک کالج خاص طور پر مسلمان خاتونوں کے
لئے تیار کیا جائے۔ ایک لاکھ کی جائداد ہے۔ میرے خیال میں کالج کے
ابتدائی اخراجات کے لئے کافی ہو گی۔ تمہاری کیا رائے ہے؟" میں نے
کہا:- "ضرور واللہ ضرور۔ خدا تمہارے ارادے میں برکت دے۔
کُل قوم احسان مند ہو گی مگر شب بخیر، نیت شب حرام۔ چلئے رات بہت آئی
ہے۔ لو ایک بج گیا اب چل کے سونا چاہیئے۔"
یہ کہہ کے ہم کوٹھی میں داخل ہوئے۔ اب کوٹھی کی ایک ایک
چیز مجھے عجیب معلوم ہوتی اور میرے دل پر عجیب اثر ڈالتی تھی۔
ہے یوں کہ ؎

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے
دو روزہ عُمر کو انسان نہ رائگاں کاٹے

مرزا پھویا علی گڈھ کالج میں

ہو وطن سے کبھی جدا نہ کوئی
گھر سے بے گھر ہوا ے خدا نہ کوئی

دردِ غربت سہا نہیں جاتا
رنجِ فرقت کہا نہیں جاتا

یاد احباب کی جو آتی ہے
دل میں اک درد سا اُٹھاتی ہے

بی بی بچّوں کا آگیا گر دھیان
سینہ کوبی سے ہو گئے ہلکان

گھر کے نقشے کا دل میں پھر جانا
اُس کا سَو سو جتن سے پھر جانا!

گھر سے بے گھر جو کوئی ہو جائے
عیش و آرام اُس کا کھو جائے

نئی دنیا بشر نیا دیکھے
گویا عالم ہی دوسرا دیکھے

الغرض یہ مصیبت ایسی ہے
ساری دنیا کے غم ہیں کم جس سے

اب سُنیں، صاحبانِ ہوش و ذکا
اک نیا ماجرا، نیا قصّہ

ایک صاحب اودھ میں رہتے تھے
مرزا پھویا، سب اُن کو کہتے تھے

کیا کہوں تھا کہاں چمن اُن کا
لکھنؤ تھا کبھی وطن اُن کا

گھر سے نکلے نہ تھے تمامی عمر
ساری بھونرے ہی میں گزاری عمر

اپنے ماں باپ کے دولارے تھے — اور عزیزوں کے وہ پیارے تھے

خیر سے تھا ابھی شباب شروع — عُمر کا بیسواں تھا باب شروع

رات دن کھیلتے مگر پھرتے — سارے گھر والے "بچہ" کہتے تھے

باتیں کرنے میں بھی لجاتے تھے — غیر شخصوں سے سہم جاتے تھے

عیش سے دن مگر گزرتے تھے — نہ کسی کا خیال کرتے تھے

چین تھا دن کو، لطف راتوں میں — وقت کٹتا تھا یُوں ہی باتوں میں

کہ فلک ہوگیا خلل انداز — تجھ سے سمجھے خدا ارے دمباز

دُور پھینکا وطن سے ہائے غضب — آخر اس دُشمنی کا کوئی سبب؟

اس کی تفصیل اس طرح سُنئے — دردِ مرزا کی پھر دوا کیجیے

قوم میں سب سے اعلیٰ و اولیٰ — محسن الملک، محسن الدولہ

دردِ قومی کے، اس معالج نے — یعنی سکریٹری کالج نے

اپنے احباب کی معیت سے — اور مشاہیر کی جماعت سے

سارے شہروں کا جب کیا دورہ — لکھنؤ بھی مشرف اس سے ہوا

دھوم تھی اک فصیح آیا ہے — نیچری فوج ساتھ لایا ہے

وقتِ تقریر اُس کا طرز بیان　　گہ شرر بار، گاہ نور فشاں
جادُو کرتا ہے، سحر کرتا ہے　　مہر کرتا ہے، قہر کرتا ہے
گہہ ہنساتا ہے گہ رُلاتا ہے　　کچھ عجب ڈھنگ اُس کو آتا ہے
جب ہوئے اُن کے دوست سارے بضد　　تب تو مرزا کے والدِ ماجد
جا کے جلسے میں خود شریک ہوئے　　سارے لکچر بغور اُنہوں نے سُنے
کر گیا اُن پہ جادو اپنا کام　　تھا علی گڈھ کا ہی زباں پر نام
ایک دم یہ تہیّہ کر بیٹھے　　بس علی گڑھ میں مرزا جا کے پڑھے
اس ارادہ کو جب کہا گھر میں　　پڑ گیا رونا پیٹنا گھر میں
چیخی مرزا کی ماں کہ "ہائے ہائے!　　کوئی جا کر زرا اُنہیں سمجھائے
ان کو تو ہو گیا ہے کچھ سودا　　سوچتے ہی نہیں بُرا و بھلا
میرا بچّہ نہ جائے گا کوئی　　میرا پتھّر کا تو نہیں کچھ دل"
نہ اُنہوں نے سُنی کسی کی بھی　　اپنی ضد ہر طرح سے پوری کی
دیدیا حکم: "جائے مرزا کل"　　ہائے! یہ حکم تھا پیامِ اجل
جوں جوں ہوتی سفر کی تیاری　　اُن پہ ہوتی تھی زندگی بھاری
آگیا وقت وہ بھی آخر کار　　ڈر سے آتا تھا جس کے ان کو بخار

وقتِ رخصت تھا، سخت مرزا پر
چاہتے تھے، مروں میں پھوڑ کے سر

کچھ بھی لیکن نہ کرتے دھرتے بنا
باپ نے جو کہا، انہوں نے کیا

شور و شیون تمام کرنے کو
گھر میں آئے سلام کرنے کو

ان کے آتے ہی مچ گیا کہرام
روتا تھا، ایک ایک دل کو تھام

خالہ اماں، ممانی، بھابی جان
اپنے مرزا پہ سب ہوئیں قربان

"یا الٰہی یہ خیریت سے پھرے
اور دشمن پہ اس کے بجلی گرے"

آپا جانی نے بھی بلائیں لیں
سب نے مِل مِل کے یُوں دعائیں دیں

"واسطہ مرتضےٰ علی کا تجھے
جلد لاکر ملائیو ہم سے"

اشک برسا کے دیدۂ تر سے
کیا کہوں مرزا چل دیئے گھر سے

مختصر یہ، پہنچ گئے وہ یہاں
آہ برلب، دروںِ سینہ فغاں

ایک ہفتہ تو کاٹا رو دھو کر
بعدۂ ہر طرح سے زچ ہو کر

اک عریضے کی یُوں بنا ڈالی:-
"قبلہ ام مدظلہ العالی

اولاً مجرا عرض کرتا ہوں
حال پھر اپنا عرض کرتا ہوں

ہو کے رخصت جناب سے پہنچا
کیا کہوں اس جگہ پہ کیا دیکھا

یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جدا
ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سُنا

جنس ہر اک نئی دُکان نئی — اَور تو اَور ہے زبان نئی!

"ایک دال"[1] "ایک گوشت" کہتے ہیں — جانے کس دیس میں یہ رہتے ہیں

ہوں پریشاں تو "آلبا" فرمائیں — خوش ہوں گر تو "ہیر ہیر" یہ سُنائیں

گر ہو اچھا لباس "ٹھاٹ" کہیں — اور گنواروں کو "راج گھاٹ" کہیں

بُو تنعّم کی ہو ذرا سی بھی — اس کو کہتے ہیں یاں پہ عیاشی

عمدہ کھانا کھلایا عیّاشی! — عمدہ شربت پلانا عیّاشی!

عطر میں گر کبھی جو کپڑے بسائیں — فوراً عیاش آپ کہلائیں

کورنش، مجرا، بندگی، آداب — سب کی یاں ہو گئی ہے مٹّی خراب

ان کے بدلے ہے بس سلام علیک — گویا لے ڈھیلا کھینچ مارا ایک

دوڑتے، کُودتے، اُچھلتے ہیں — بھُول کر بھی نہ سیدھے چلتے ہیں

کوئی مارے پھلانگ تو یہ خوش — ٹُوٹ جائے جو ٹانگ تو یہ خوش!

گیند بلّا، سواری اور فٹ بال — یہ یہاں کے ہیں کھیل، یہ اشغال

گر پڑے گر کوئی تو خوش ہو جائیں — اور پھر خوب، خوب تالی بجائیں

[1] یہ اصطلاحات وہ ہیں جو میرے زمانہ علی گڈھ میں رائج تھیں۔ غالباً اب بھی ہونگی چونکہ مرزا پھویا میرے زمانہ کالج میں تشریف لائے تھے، لہٰذا انہیں اصطلاحات کا ذکر کیا گیا۔
(سجاد)

صبح ہوتے ہی کرتے ہیں ڈمیل ۔۔۔ نہ جبیں پر شکن، نہ دل پر میل
صبح تڑکے، ڈرِل کراتے ہیں ۔۔۔ ایسے بے رحم ہیں تھکاتے ہیں
جو قواعد کراتے ہیں سب کو ۔۔۔ کیا دعا دوں میں ایسے بیڈھب کو
ہو گئی میری جان بھی بیکل ۔۔۔ جب وہ چیخے: "بریک ان ٹو ڈبل"
حکم ہے وقت پر ہی کھانا کھاؤ ۔۔۔ شام کو جمع اک جگہ ہو جاؤ
بھوک ہو یا نہ ہو نہیں پروا ۔۔۔ ہے اُسی وقت ٹھونسنا پڑتا
یاں کی آزادی ہے بہت محدود ۔۔۔ شہر جانا بھی ہو گیا مسدود
اِس لئے عرض ہے کہ یہ چیزیں ۔۔۔ لکھنؤ سے روانہ آپ کریں:۔
ایک ڈبیہ دیا سلائی کی ۔۔۔ پوڑیا اک نیلی روشنائی کی
اک بُرش جُوتہ صاف کرنے کا ۔۔۔ اور برانکو بھی ساتھ تھوڑا سا
بُوٹ کے لیس کی ضرورت ہے ۔۔۔ اور موزے بھی چند اچھے سے
دو گھڑے، اک صراحی، پیالے چار ۔۔۔ اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار

اور باقی تو خیریت ہے سب
سب کو تسلیم، زیادہ حدِ ادب

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

(ایک مضمون نگار کی شکایت احباب سے)

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن میں دلّی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا، کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی، جو بڑے موثر طریقے سے اپنی حالت زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفہ کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ اُنہیں الفاظ اور اُسی پیرایہ میں دہرا دی جاتی تھی یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا کہ میں اس شخص کو دیکھنے اور اُس کے الفاظ سُننے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا جسم خوب موٹا تازہ تھا اور چہرہ ایک حد تک خوبصورت ہوتا، مگر بدمعاشی اور بیحیائی نے صورت مسخ کردی تھی۔ یہ تو اُس کی شکل تھی۔ رہی اس کی صدا، تو

مَیں ایسا قسی القلب نہیں ہوں کہ صرف اُس کا مختصر سا خُلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ لفظ بلفظ لکھی جائے۔ چنانچہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ کہئے یہ تھی :-

"اے بھائی مسلمانو! خدا کے لئے مجھ بدنصیب کا حال سنو:- مَیں آفت کا مارا، سات بچوں کا باپ ہوں۔ اب روٹیوں کو محتاج ہوں اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ مَیں بھیک نہیں مانگتا، مَیں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں، مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پُہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! مَیں غریب الوطن ہوں، میرا کوئی دوست نہیں۔ ہائے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خدا کے بندو میری سنو، مَیں غریب الوطن ہوں"

فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر اس کے قصّے کا اثر ہوا، ان کی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور مَیں نے اپنی حالت کا مقابلہ اُس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں مَیں نے اُس کو اپنے سے اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ مَیں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا

ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں، وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے، بس یہاں تک میں اُس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اُس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے اُس کی صحّت پر مجھے رشک کرنا چاہیئے، میں رات دن فکر میں گزارتا ہوں اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک میں غور کرتا رہا کہ اس کی یہ قابلِ رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ اور آخر کار میں اس بظاہر عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے وہی اُس کے حق میں نعمت ہے وہ حسرت سے کہتا ہے کہ "میرا کوئی دوست نہیں" میں حسرت سے کہتا ہوں:۔ "میرے اتنے دوست ہیں"۔ اُس کا کوئی دوست نہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اُسے مبارک باد دینی چاہیئے۔

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا، مکان پر آیا: کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خوش نصیب شخص! یہیں تو تو مجھ سے بڑھ گیا، لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی

ہے؟ یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں کی طرح اُسے دن بھر میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے؟ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا کہ مَیں تخلیے میں اپنے خیالات جمع کر سکوں اور اُنہیں اطمینان سے قلمبند کر سکوں، یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے اُسے سوچ سکوں۔ کیا یہ فقیر دن دھاڑے اپنا روپیہ لے جا سکتا ہے اور اُس کا کوئی دوست راستہ میں نہ ملے گا اور یہ نہ کہے گا :-

"بھائی جان! دیکھو پُرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے اس وقت ضرورت ہے، تھوڑا سا روپیہ قرض دو" کیا اس کے احباب، وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اُسے نیند کے جھونکے آ رہے ہوں، مگر یار دوستوں کا مجمع ہے جو قصّے پر قصّہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور اُٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اُسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے

اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہُو حق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں مُلاقات کو اُسے جانا نہیں پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا؟ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجّب نہیں کہ وہ ہٹّا کٹّا ہے اور مَیں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللہ کیا اس پر بھی وہ شکر ادا نہیں کرتا؟ خدا جانے وہ اور کونسی نعمت چاہتا ہے؟ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں! بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی ہے اور یہ اُن سے بھاگتا ہے۔ مگر میں دوستوں کو بُرا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے پاس آتے ہیں اور میرے خیر طلب ہیں، مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پُہنچانے کا اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفرین کی جائے مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ ثابت نہ کر سکا کہ احباب کا ایک جم غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو

وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دُنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی میں عمر نہیں گزارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا، چاہے اس سے میرے دل پر کیسا ہی صدمہ ہو۔

مثلاً میرے دوست احمد مرزا ہیں، جنہیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں، یہ نہایت معقول آدمی ہیں اور میری اُن کی دوستی نہایت پُرانی اور بے تکلفی کی ہے، مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے، شور مچاتے ہوئے، چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ ان کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں:۔ "کوئی آرہا ہے، قیامت نہیں ہے"۔ ان کے آنے کی مجھے دُور سے خبر ہو جاتی ہے باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ "میاں! اس وقت کام میں بہت مشغول ہیں"، تو وہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں، کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) خیراتی!

کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے؟ توبہ توبہ! اچھا بس میں ایک منٹ ان کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھٹ پٹ ہو گئے نا؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اوپر آتے ہیں اور دروازہ کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آکے لگا (آج تک اُنہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں:۔

"اہاہاہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا، مگر دیکھو دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو، میں حرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے، کہو طبیعت تو اچھی ہے؟ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے تو اب جاتا ہوں، میں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا، تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی، خدا حافظ۔" یہ کہہ کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ اُنگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے

اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا اپنے ساتھ میرے کُل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اب وہ کہاں؟ اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے۔ تاہم وہ اگر گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا میں اُنہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور ان کی دوستی بہت پُرانی اور وہ مجھ سے بھائیوں کی طرح محبّت کرتے ہیں، تاہم میں اُنہیں چھوڑ دوں گا۔ ہاں چھوڑ دوں گا، اگرچہ کلیجے پر پتّھر رکھنا پڑے۔

اور لیجئے، دوسرے دوست محمّد تحسین ہیں۔ یہ بال بچّوں والے صاحب ہیں، اور رات دن انہیں کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں، جب میں کام سے تو فارغ ہو چکتا ہوں لیکن اِس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک گھنٹہ آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں، مگر تحسین آتے ہیں اور اُن سے ملنا ضروری ہے

اُن کے پاس باتیں کرنے کے لئے، سوائے اپنی بیوی بچّوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش کروں مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں ہاں بڑا خراب موسم ہے، میرے چھوٹے بچّے کو بخار آگیا، منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔ اگر پالی ٹکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو شروع کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار رہے، مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لئے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ "طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں معلوم ہوتی؟" کبھی کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں، جنہیں اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریقِ مخالف کی بُرائیوں، اور جج صاحب

کی تعریف یا مذمت کے (تعریف اس حالت میں جب کہ اُنھوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ من جملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے، میں محمّد شاکر خاں صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا، کیوں کہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں شاکر خاں صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت معزّز آدمی ہیں۔ اُنہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے، لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں، جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ اُن کا خیال ہے کہ اہلِ علم کی تھوڑی سی قدر کرنا، امرا کے شایان شان ہے ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے یہ کہہ کے :۔

"شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے، دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہو گی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے جس میں پڑھنے

لکھنے کا سب سامان مہیّا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا۔ دیکھو! میری خوشی کرو۔"

میں ایسے محبّت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا؟ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ "ایڈیٹر معارف" سے وعدہ کر چکا تھا کہ ایک خاص عرصہ میں اُن کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل میں تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی ایک کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھُلتی تھی، اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتہ کی غرض سے بُلایا گیا، جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے جانے کے لئے اُٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ: "ہیں! ہیں! کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی سے کام شروع کر دو۔ اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو اور

آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سینری کا لطف اُٹھانے میں گزارا جائے۔ چلئے گاڑی تیار کراتے ہیں، دریا پہ مچھلی کا شکار کھیلیں گے۔ پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے، آپ کو وہاں کے رئیس راجہ طالب علی صاحب سے ملائیں گے۔"

میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت معلوم! اخیر سیکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت تو میں بچ گیا اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے، مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جس عنقا یعنی یکسوئی کی تلاش میں مَیں سرگرداں تھا، وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

مَیں جلدی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اُس وقت ذرا غور سے اُس میز کے سامان کو دیکھا، جو میرے لکھنے پڑھنے کے لئے تیار کی گئی تھی، میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا، جس پر سیاہی کا ایک قطرہ گرانا، گناہ کبیرہ سے کم نہ ہوگا چاندی کی دوات، مگر سیاہی دیکھتا ہوں تو سُوکھی ہوئی۔

انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب مگر اکثریں نب ندارد جاذب کاغذ ایک مخملی جلد کی کتاب میں مگر لکھنے کے کاغذ کا پتا نہیں۔ اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا، مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں۔ اور جو چیزیں کہ ضرورت کی تھیں وہ موجود نہیں۔ آخر کار میں نے اپنا وہی پرانا استعمالی، نگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمان داری سے میری مدد کی تھی اور میرے پرّاں خیالات کو تیزی کے ساتھ قفس کاغذ میں بند کیا تھا) نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مُرغانِ خوش نوا کی تعریف میں شعرا اس قدر رطب اللسان ہیں ان کی اس عنایت سے میں خوش نہیں ہوا کہ سب کے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا، تاہم میں نے کوشش کر کے اُن کی طرف سے کان بند کر لئے اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

... تن، تنتن، تنتنانا، چھن، تاتن، تن تن تن۔ میں ایسا مصروف تھا کہ دُنیا اور مافیہا کی خبر نہ تھی، یکایک اس تن تن نے چونکا دیا، ہیں یہ کیا ہے؟ اوہ! اب میں سمجھا، میرے کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے! انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے۔ اس وقت ستار سے شوق فرما رہے ہیں۔ بہت خوب بجا رہے ہیں:۔

"اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہتِ زلف لائے کیوں؟
مجھ کو صبا سے ہے اُمید، اہا مجھ کو صبا سے ہے اُمید،
مجھ سے صبا کو کیا غرض"

واہ وا! سبحان اللہ کیا غزل چھیڑی ہے۔

"اے ترک سوار نواح عربی یثرب نگری پہنچا دینا
کس رنگ میں ہے وہ جیبِ مرا، مجھے واکی کھبر یا لا دینا"

بہت ہی خوب! کمال کرتے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ اُنہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ

اپنے کمرے سے چلے گئے، اور خاموشی طاری ہو گئی، تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔

"اے میرے خیالات، تمہیں میرا گنجینہ، میرا خزانہ ہو، خدا کے لئے رحم کرو، میرے دماغ میں پھر آجاؤ۔" یہ کہہ کے میں کاغذ کی طرف متوجہ ہوا کہ دیکھوں کہاں چھوڑا ہے۔ میں اس فقرے تک پہنچا تھا:۔

"ہم اس وسیع اور دقیق مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں اتنا ہی، اُس کی مشکلات کا مثل ....."

مثل کے آگے میں کیا لکھنے والا تھا؟ "ریگ دریا کے اندازہ نہیں کر سکتے؟" ہرگز نہیں۔ ایسا معمولی فقرہ تو نہ تھا، مجھے یقین ہے کہ کچھ اور تھا، کوئی اعلیٰ درجے کی تشبیہ تھی اور فقرے کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنے والا تھا، خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھا کیا نہ تھا، اب تو دماغ میں اُس کا پتہ بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے کہ:۔

"اُس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہتِ زلف لائے کیوں؟

مجھ کو صبا سے ہے اُمید، مجھ سے صبا کو کیا غرض؟"

مگر میرا تو صبا کے نام نے دماغ خالی کر دیا، اگر وہ آتی اور نکہتِ زلف بھی لاتی تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ بہرحال اب مجھے وہ فقرہ ازسرنو درست کرنا چاہیئے۔ مشکلات کی بجائے کچھ اور ہونا چاہیئے۔

"ہم اس وسیع مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں، اُتنا ہی ان بیش بہا، علمی جواہر کو جو ہمارے ملک اور قوم کے علمی خزانے کے پُر کرنے کے لئے کافی ہیں اور جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے؟" یہ کیا مہمل فقرہ ہوا! لاحول ولاقوۃ میں بھی کیا گڑبڑ کر رہا ہوں "آپ کہاں بھُول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے" یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب نے کسی دوست سے کہے ہیں جو ابھی اُن سے ملنے آیا ہے۔ بس مصروفیت میں انہیں ہی لکھ گیا۔

ہاں تو کاٹ کے فقرہ درست کرنا چاہیئے: "اور جن کی قدر

ابھی تک مُلک و قوم کو معلوم نہیں ہوئی ہے اور بظاہر"

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں شبّن! سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو نیچے ذرا سی دیر کے لئے تشریف لائیے، کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور سرکار اُنہیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں"

بادلِ ناخواستہ میں اُٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے تھے، اُن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شبّن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی، ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا، گویا میں بھی مثل اُس عربی گھوڑے کے تھا جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پاکر

اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے، فقرہ از سر نو پھر بنانا پڑا، طبیعت اچاٹ ہو گئی، بہر ار وقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا:۔

ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیقات کا شوق ہے اور جو کولمبس کی طرح نئی معلومات اور نئی دُنیا (گو وہ علمی دنیا ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں"

دروازہ پر پھر دستک۔

"کیا ہے؟"

"اچھّا"

دریافت کرنے کے لئے اپنے خطرے میں ڈالنے سے بھی خوف نہیں کھاتے، ضرور اس طرف متوجہ ہونگے اور اپنی کاوشوں اور کوششوں سے موجودہ ......"

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

"ہاں"

"حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔"

"افوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں۔ میں پھر کھا لوں گا۔ اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں۔" "اور آیندہ نسلوں کو زیر بار احسان کریں گے۔ یہی وہ نوجوان ہیں جو قوم کی کشتی کو، خدا کی مدد پہ بھروسہ کر کے خطرات سے بچاتے اور ساحل مراد تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ ...."

دستک۔

"کیا ہے؟"

"سرکار کہتے ہیں اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اُسی وقت کھائیں گے، مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا۔"

"اچھا بھائی لو ابھی آیا۔"

یہ کہہ کے میں کھانے کے لئے جاتا ہوں، سب سے معذرت کرتا ہوں، میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں :۔ "چہرے پر تھکن معلوم ہوتی ہے۔ کیا بہت لکھ ڈالا، دیکھو میں تم سے کہتا تھا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں ہے؟"

سوائے اس کے کہ آمنا وصدقنا کہوں اور کیا کہہ سکتا تھا؟ اب کھانے پر اصرار ہوتا ہے، جس چیز سے مجھے رغبت نہیں وہی کھلائی جاتی ہے۔ بعد کھانے کے، میزبان صاحب فرماتے ہیں :۔ "سہ پہر کو تمہیں گاڑی میں چلنا ہوگا۔ میں تمہیں اسواسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کرو۔"

واپس کمرے میں آکر میں تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کر لوں اور پھر لکھنا شروع کردوں۔ مگر اب خیالات کہاں ہیں؟ مضمون اُٹھا کر دیکھتا ہوں: "زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ!" اس کے متعلق کیا لکھنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اس کو

پہلے فقروں سے کیوں کر ربط پیدا کرنا تھا۔ یوں ہی پڑے پڑے نیند آجاتی ہے۔ تیسرے پہر اُٹھتا ہوں تو دماغ نہایت صحیح پاتا ہوں "زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ" بالکل حل ہو جاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینہ کی طرح صاف نظر آتا ہے میں خوشی خوشی اُٹھ کر میز پر گیا اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک!

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے، سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، میں فوراً نیچے جاتا ہوں تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب کہتے ہیں یہ ہوتا ہے: "آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے"۔ میں سچّی بات کہوں کہ "کچھ بھی نہیں لکھا" تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ "آخر اس قدر کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے؟ ؎

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھایئے قسمیں
مجھے یقیں ہوا اور مجھ کو اعتبار آیا"

ہل ملا کر شام کو واپس آئے، کھانے کے بعد باتیں ہوتی ہیں سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں، وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ غصّہ اور رنج میں آکر

اُسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے، اپنے گھر واپس چلا آتا ہوں۔ میں ناشکرا اور احسان فراموش کہا جاؤں گا، مگر میں مجبور ہوں اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دونگا۔

میں نے ذرا تفصیل سے اُن کا حال بیان کیا ہے، مگر یہ خیال نہ کرنا کہ یہیں اُن احباب کی فہرست ختم ہو گئی جن سے میں رخصت طلب کر سکتا ہوں نہیں ابھی بہت سے باقی ہیں مثلاً۔ ایک صاحب ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے مگر جب آتے ہیں میں اُن کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں جب مجھ سے ملتے ہیں کہتے ہیں "میاں! عرصہ سے میرا دل چاہتا ہے تمہاری دعوت کروں" مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست ہیں، وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں، جب میں جواب دیتا ہوں، تو متوجہ ہو کر نہیں سُنتے یا اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں، یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو جب آتے ہیں اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ میری نہیں سُنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں، صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر اک سے کہہ سکتا ہوں ؎

"مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"

اب چونکہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کر دیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کر دوں۔ دروازے پہ ایک گاڑی آ کے رُکی ہے، میں سمجھ گیا کہ کون صاحب تشریف لائے ہیں میں اُن کی شکایت نہیں کرنے کا، کیونکہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ کسی کرم فرمانے کرم نہیں فرمایا اس لئے اس کے شکریہ میں میں اس مضمون کو اسی ناتمام حالت میں چھوڑتا ہوں اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب آتے ہیں مجھ پہ اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ "تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے" میں جانتا ہوں کہ اس وقت بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے جو بڑا حاذق ہے یا کوئی مجرب نسخہ میرے لئے کسی سے مانگ کر لائے ہونگے۔

"آئیے آئیے، مزاج عالی، بہت دن بعد تشریف لائے"

(دلّی)

غُربت وطن

رشید، لکھنے کی میز پر، داہنا ہاتھ، اور ہاتھ پر سر رکھے ہوئے خیال میں مستغرق بیٹھا ہے۔ لمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ گو شہر میں (اُس شہر میں جہاں رشید، غُربت کے دِن، اُنس و اضطراب کی کچھ عجیب آمیزش کے ساتھ کاٹ رہا ہے) گو اس شہر میں اس وقت خاموشی چھائی ہوئی ہے، لیکن اس کے دل میں خیالات کا طوفان موجزن ہے۔

چار طرف سناٹا ہے اور تاریکی، صرف کمرے میں گھڑی کھٹ...... کھٹ...... کھٹ کر رہی ہے، گلی کا کُتّا بھونکتا ہے، قریب کے کمرے میں نوکر، دِن کا کام ختم کر کے گہری نیند (حیات ساعیانہ کا انجام!) سو رہا ہے، اور اس کی

خرخراہٹ کی آواز یہاں تک آرہی ہے۔ رشید اپنے خیالات سے عاجز آکر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور بہت مضطرب حالت میں، کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے، اور اپنے دل سے باتیں کرنے لگتا ہے:۔

غُربت اچھّی کہ نئی دُنیا، نیا آسمان، نئے مناظر پیشِ نظر ہوتے ہیں۔

نہیں، وطن اچھا کہ پُرانے دوست، پُرانے رفیق، جانی پہچانی آوازیں، جانی پہچانی صُورتیں، سُنائی دیتی ہیں، دکھائی دیتی ہیں۔

نہیں، غُربت اچھّی جس میں ہر تجربہ نیا، ہر بات نئی۔ جو دو آدمی ملتے ہیں گویا دو دریا ہیں کہ پہلے جُدا جُدا بہ رہے تھے، اب سنگم ہوا۔

نہیں، وطن اچھّا، جہاں پُرانے دوست گویا دو پودے ہیں کہ ایک دوسرے سے پلیٹے ہوئے اُگے اور بڑھے۔

نہیں، غُربت اچھّی، جہاں دوست نما دشمن اور آشنا صورت اغیار تو نہیں ہوتے جن کی مدارات کرنی پڑے جہاں غیر یہ صاف کہہ کے ملتا ہے کہ میں غیر ہوں، اور دوست، آہ! دوست نہیں تو شناسا بن کے جُدا ہوتا ہے۔

نہیں، وطن اچھا، جہاں وہ آدمی نہیں ملتے، جن سے دل میں نہ حسِّ محبّت پیدا ہو، نہ یادِ ایّامِ گزشتہ۔

نہیں، نہیں، بے یار نہ غربت اچھی، نہ وطن اچّھا، اور یہ با یار — یہ اُن خوش نصیبوں سے پُوچھئے جو یار رکھتے ہیں۔"

رشید ایک آرام کرُسی میں گر پڑتا ہے، اور پھر خاموش، خیالات میں محو ہو جاتا ہے، پھر تھوڑی دیر کے بعد کاغذ کے ٹکڑے پر پنسل سے کچھ لکھتا جاتا ہے۔

یہ ایک زائیدہ اضطراب غزل تھی، جسے وہ تسکین خاطر کے لئے کونے میں رکھے ہوئے ہارمونیم پر جا کر بجاتا ہے:۔

غزل

ہے سینہ وقفِ مرا سوزشِ نہاں کیلئے
سِئے ہیں ہونٹ مرے نالہ و فغاں کیلئے

ہمارے سارے گلے اپنے مہرباں کیلئے
کوئی زمانہ کا شاکی، کوئی فلک کا ہے

ہے اک نگاہ کا اغماض نیم جاں کیلئے
ہلاک کر کے رہیگا، مجھے تغافل دوست

رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کیلئے
ہُو ڈھونڈ ڈھونڈ کے سب مجھ پہ مشق اے احباب

ہوئے جو طعنۂ اعدا کبھی فرا کو بند — زباں سے کام اعزا نے خودستاں کیلئے
کڑک چمک تو نہ اے برق اس سے کیا حاصل — شرارہ ایک تھا کافی اس آشیاں کیلئے
مرا جو حصہ ہے، وہ مجھ کو اے مصیبت دے — ہوا کرے، ہے اگر عیش کُل جہاں کیلئے
چمن میں بُلبلِ مہجور کی نہیں کچھ یاد — تڑپ رہی ہے قفس میں بوستاں کیلئے
بُھلا دے یادِ وطن جب میں جانوں اے غُربت! — وطن کا عشق ہے اک روگ میری جاں کیلئے

مقابل کے مکاں کی کھڑکی کھُلتی ہے، اور رشید کا پڑوسی، اس شہر کی زبان میں کہتا ہے:-

"مسٹر رشید! شاید آج آپ کے وطن سے کوئی بڑی خوشخبری آئی ہے۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے۔ لیکن میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، (اور ذرا معترضانہ تبسم سے) مگر آدھی رات کو تو خوشی نہ منانی چاہیئے"

صحبتِ ناجنس

(دو لڑکیوں میں خط و کتابت)

حیدر آباد دکن، ۲۴-ستمبر ۱۹۲۵ء

میری پیاری سلما جانی! جو باتیں میں کسی سے کہہ نہیں سکتی وہ تمہیں لکھنا چاہتی ہوں، ہائے وہ مدرسے کے دن کہ جب مجھے کوئی تکلیف ہوئی یا مرضی کے خلاف کوئی بات ہوئی اور میں تمہارے کمرے میں پہنچی، اگر تم کسی بات کسی کام میں مشغول بھی ہوئیں تو بے تحاشا تم سے لپٹ کے، گلے میں بانہیں ڈال کر، تمہارا منہ چوم کے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اپنا دردِ دل تمہیں کہہ سنایا اور دل کی بھڑاس نکال لی۔ حیدر آباد! آہ کتنی دور ہوں، پھر اللہ رکھے۔ تم میاں رکھتی ہو، بال بچے رکھتی ہو، گھر کے کام دھندے میں مشغول ہو، دیکھوں تمہیں اس خط کے پڑھنے کا وقت بھی ملتا ہے یا نہیں۔

مجھے یہ خط بہ خیریت سے ہوں اور تمہاری خیر و عافیت کی

خواہاں" سے شروع کرنا چاہیئے تھا۔ مگر طبیعت یکسُو ہوتی تو کرتی، تمہاری طرح تھوڑا ہی ہوں، تمہاری زندگی میں نہ کوئی شے زیادہ نہ کوئی شے کم، جو تم چاہتی تھیں وہ سب موجود ہے، مجھے دیکھو؟ مجھ پہ کیا پتا پڑی! پوچھو تو سُناؤں اور دل نہ بھرے، نہ پُوچھو پھر بھی سُناؤں گی۔

میں نے تمہیں نہیں لکھا، تین مہینے ہوئے میں دُلہن ہو گئی، وہ عذرا جسے تم ہمیشہ "دیوانی لڑکی" کہا کرتی تھیں اب "عقل والی عورت" ہے مصیبتوں نے سنجیدگی سکھا دی۔

ابھی آدھ گھنٹہ ہوا، ایک دیو گھر سے باہر گیا ہے اور میں نے ایسا سانس لیا ہے، گویا بڑے ضیق سے نجات پائی، میرے ہول دل کو تھوڑا سا آرام ہُوا تو میں نے یہ خط لکھنا شروع کیا، ان تین مہینوں میں ہر روز تمہیں خط لکھنے کا ارادہ کرتی تھی، مگر پریشانیوں سے جو سُستی، اور خوف سے جو عطالت بدن میں پیدا ہو جاتی ہے اُس نے اِس ارادے کو پُورا نہ ہونے دیا صبح نہیں ہوتی کہ شام ہو جاتی ہے، صبح کھانے کے وقت، ہم اپنے

کمرے سے نکلتے ہیں۔ اور اُس وقت میرا پیارا دیو پنجہ، دیو جُثّہ، اپنی ٹوپی عجب لااُبالی ڈھنگ سے آدھے سر پر رکھ کر کوٹ عجب بے پروائی سے پہن کر باہر جاتا ہے، میری جان میں جان آتی ہے کہ اتنے میں عورتیں ملاقات کے لئے آجاتی ہیں، اُن سے سر کھپاتی ہوں، تیسرے پہر کو میں کپڑے بدل کے تازی ہوَا کھانے کے لئے اپنے ایک قفس سے نکل کر، دوسرے قفس میں بیٹھ کر (جس کی جھلملیاں بند ہوتی ہیں) باغ عامہ کا نظارہ کرتی ہوں، شام ہوتے ہی گھر پہنچتی ہوں، لیکن وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود ہوتا ہے، رات کو گھر میں سنّاٹا ہو جاتا ہے، اور اُس خوفناک قوّی ہیکل بُت سے میری نفرت اَور بڑھ جاتی ہے۔

یہ شادی کس طرح ہوئی، اس کی تاریخ میں تمہیں نہ لکھونگی کیا فائدہ۔ صرف ان تین مہینوں کی زندگی کی تصویریں ایک ایک کرکے پیش کرتی ہوں، انہیں دیکھو، اور میری سلما! مجھ پر دل دُکھاؤ۔ وہ لڑکپن کی اُمیدیں ایک لال کی ہلکی پرواز کی طرح غائب

ہوگئیں، اُڑ گئیں، ایک چھوٹی چڑیا کی طرح اُن کا خون ہوگیا۔
بیاہ کے بعد تیسرا یا چوتھا دن تھا، میں پیانو کے پاس بیٹھی تھی، وہ مجھ سے ذرا دُور آرام کرسی پر ڈھیر ہو رہے تھے، میں یونہی بیٹھی بیٹھی پیانو کو بجا نہیں رہی تھی، بلکہ کھیل رہی تھی کہ میرے کانوں میں وہ بھاری اور کرخت آواز آئی۔

"ہم سُنتے ہیں آپ بہت اچھے گانے گاتی ہیں، اگر دو ایک ہم کو سُنائیں گا، تو بڑی مہربانی ہوگی"۔

میں رُکی، اور استعجاب آمیز سوال کی نظر سے اُن کی طرف دیکھنے لگی، معلوم نہیں کہ اس نظر کے اُنہوں نے کیا معنی لئے کہ کہنے لگے:۔

"کوئی راگنی، کوئی ٹپہ، کوئی غزل ہمارے واسطے ہونا، ہم یہ نہیں کہتا کہ کیا سُناؤ، آپ کو جو پسند ہو وہ سُناؤ......

میں مبہوت نظر سے دیکھ رہی تھی اور اس تقریر کو سُن رہی تھی، وہ پھر فرمانے لگے:۔

"اچھا اور کچھ نہیں تو یہ غزل تو سُناؤ:۔

"دونوں ہاتھوں میں مہندی لگالے پری
لگالے پری، ہاں لگالے پری"

میں کیا جواب دیتی، حیران تھی، وہ مسلسل گانے کے لئے چیزیں پیش کرتے جاتے تھے۔

"اچھا صاحب! غزل نہیں تو کوئی ناٹک کی چیز سہی۔
دیتا ہوں تجھ کو تخت سلیماں کی قسم
(اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھکر پورے جوش اور نہایت محبت اور حرص بھری نظر سے مجھے دیکھ کر)
مل مجھ سے اے پری تجھے انساں کی قسم"

مجھے چپ لگی ہوئی تھی، آخر کار وہ اٹھ کر اور پیانو کے قریب آکر فرمانے لگے:۔

"صاحب! کیا غضب ہے میں اس قدر التماس کیا ہوں آپ قبول نہیں کرتے ہو، مہربانگی کرکے ہماری لال یا امانت کی کوئی چیز آپ سُنا دینگے تو کیا ہوگا"

میں نے بہت چاہا کہ ان کا خیال کسی اور طرف ہٹ جائے، لیکن میں دیکھتی تھی کہ ان کا اصرار بڑھتا ہی جاتا ہے، آخر میں نے مجبور ہوکر کہا:۔

"مدارؔی لال اور امانت کون ہیں؟ میں نے تو کبھی ان کا نام بھی نہیں سُنا۔"

یہ میں نے صفائی سے جواب دے دیا تھا، تم ہی بتاؤ تم نے بھی کبھی ان کا نام سُنا ہے؟ ہم نے تو نہ مدرسے ہیں، نہ گھر میں، نہ کسی کتاب میں یہ نام دیکھے، مگر انہوں نے اُسے بناوٹ سمجھا اور فرمانے لگے:۔

"ایں! آپ نہیں جانتے، پر میں تو جانتا ہوں، ہندوستان کیا، دکن کیا ہر جگہ ان کا نام مشہور ہے۔" اور تھوڑے سے سکوت کے بعد، ایک پُرنزاکت مگر معنی دار تبسّم کے ساتھ فرمایا:۔

"خفا نہ ہو صاحب! جو گانے آپ کو پسند ہوں وہی ہم کو سُناؤ۔ البتّہ وہ اچھّے ہونگے۔" پیاری سلما! پیاری بہن! تم ہی خیال کر سکتی ہو کہ میں کس مصیبت میں تھی، میرا چہرہ کچھ شرم، کچھ غصّہ سے تمتما اُٹھّا، اور قریب تھا کہ مَیں بیہوش ہو جاؤں، مگر ضبط کیا اور طبیعت کو تھاما۔

آہ! مس میری، آئیے اور اپنی چہیتی شاگرد کو دیکھئے کہ

پیانو کے سامنے عاجز، صُمٌّ بکمٌ بیٹھی ہے۔ وہ اُنگلیاں جنہیں آپ پیانو بجاتے ہوئے دیکھ کر تعجّب کیا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ خدا نے انہیں محض موسیقی کے لئے پیدا کیا ہے، آیئے اور اُن اُنگلیوں کی ذلّت کو دیکھئے، سات برس متواتر اسی دن کا خیال کر کے، اسی دن کے لئے تیاری کی تاہم اُن تمام کوششوں کا نتیجہ دیکھئے۔ مدارى لال اور امانت آتے ہیں اور آپ کی تعلیمات سب بیکار رہ جاتی ہیں! کیا یہ ہونا تھا، کیا اِس لئے میں نے اتنی محنت اُٹھائی تھی، اگر یہ تمام تعلیم بے سود تھی، یعنی اگر بینڈلسوں[۵۱] اور ویگنر[۵۲] مداری لال کے حضور میں سر جُھکا کر بھاگ جانے والے تھے، تو یہ تعلیم ہی کیوں دی گئی تھی۔ میری سلما! بتاؤ؟ آخر کیا فائدہ، بتاؤ؟ میں اپنے امانت کے شیدا خاوند سے کیا کہوں، کیا عذر کروں؟

ہاں، میرا خاوند مجھ سے "دونوں ہاتھوں میں مہندی لگائے پری" یا "بل مجھ سے اے پری تجھے انسان کی قسم" کا طالب ہے۔ میں کیا جواب دُوں؟ میں اُن چیزوں سے واقف نہیں، مجھے ہندی

۵۱ ۵۲ یورپ کے مشہور موسیقی داں ہیں۔

گانے نہیں سکھائے گئے۔"

میں نے سات آٹھ برس انگریزی گانے سیکھے ہیں یہی جواب تھے جو میں دے سکتی تھی اور یہی دیئے۔

اس پر انہوں نے نہایت اخلاق اور نرمی سے کہا:۔

"بہتر! انگریزی گانے ہی سُنائیے، میرے کو وہ بھی پسند ہوتے ہیں۔"

میں اتنی دیر تک انکار کرنے سے شرما رہی تھی، میں نے سوچا کہ جو کچھ میں جانتی ہوں انہیں سُنانا چاہیئے اس لئے میں نے پوچھا، "کونسا گانا گاؤں؟"

صاحب! جو آپ کی خوشی ہو گاؤ، میں کیا کہوں۔"

اس جواب سے میرا دل بیٹھ گیا، مگر میں نے پھر ہمت کرکے کہا: "میں (BULBUL AND[1] THE ROSE) سُناتی ہوں۔"

یہ کہہ کے میں نے پیانو کے نوٹ پر نظر گاڑ کر، بجانا شروع کیا پیانو سے ایک درد انگیز فریاد (یاد ہے، یہ مس میری کے

[1] ایک انگریزی گانا۔

الفاظ ہیں، وہ اس راگ کے بجانے کے وقت کہا کرتی تھیں کہ پیانو سے (PLAINTIVE CRY نکلتی ہے) نکلنا شروع ہوئی اور میں اس میں محو ہو گئی، غیاث الدین (میرے خاوند غیاث الدولہ، غیاث الملک کا یہ نام ہے، معاف کرنا بھول گئی، میں اب انٹروڈیوس[1] کرتی ہوں) کچھ دیر تک پیانو کے قریب آ کر کھڑے رہے، پھر آنکھیں اس طرح کھول دیں، گویا پیانو کے شور سے گھبرا رہے ہیں، لیکن سننے کی وضع قائم رکھی، دو ایک منٹ سنا بھی، آخر اس حالت میں نہ رہا گیا، بیٹھے، اٹھے، پھر بیٹھے، پھر اٹھے، ایک سگریٹ جلایا، پھر آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ میں نے جب دیکھا تو راگ کے پہلے ٹکڑے کو تو خواہ نخواہ پورا کیا، اور آخری الفاظ کے لئے پردوں پر نہایت زور سے انگلی مار کر ختم کیا، ختم ہوتے ہی فرمایا: "ماشاء اللہ، بہت خوب، لیکن اب سونا چاہیئے"، کیا دلشکن داد ہے، اے بیداد! وہ یہ داد دے کر کپڑے بدلنے کے لئے چلے گئے اور

[1] معروف انگریزی لفظ بمعنی تقریب ملاقات۔

وہاں سے بلّی کی خُرخُر کی طرح یہ آواز آنے لگی: ؎

مَیں قُربان زُلفوں کے لٹکانے والے

مرے دِل کو گلیوں میں بھٹکانے والے

اور میری نظروں میں یہ تصویر پھر گئی کہ مسّ میری اور دیگر کو مداری لال نے کیچڑ میں پھینک دیا ہے، اور خود خشکی پر کھڑا ہوا زور زور سے قہقہہ لگا رہا ہے۔

سلما جانی! ذرا خیال کرنے کا مقام ہے۔ میں کہ دیوانہ وار ہوس کے ساتھ موسیقی کی عاشق ہوں، اور سات آٹھ برس سے اُسے سیکھ رہی ہوں، ہندوستانی راگ کتنے جانتی ہوں؟ مولانا حالی کا

"اے خاصۂ خاصانِ رُسُل وقت دعا ہے"

اور غلام احمد خاں احمدی کا:۔

"آ ہمتِ مردانہ جگر میں تری جا ہے — مت آنکھ چرا مجھ سے اگر شرطِ وفا ہے"

"تو ہو مرے ہمراہ تو پروا مجھے کیا ہے — سایہ ترے شہ پر کا بہ از بالِ ہُما ہے"

یا اَشادیا مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی اور ایک آدھ نظم، جسے مِس میری نے بدقّت تمام اجازت دی تھی کہ ہم لوگ یاد کر لیں، اور پیا نو یا ہارمونیم

پر بجائیں، کیونکہ وہ کہا کرتی تھیں کہ ہندوستانی راگ یاد کرنے سے تمہارا انگریزی مذاق بگڑ جائیگا۔

وہ ہیں کہ رات دن ہندی راگوں میں محو ہیں اب بنے تو کیسے بنے لُطف تو جب آتا ہے، جب میں خیال میں مستغرق ہو کر اولڈ لینگ سائین[1] (O.LD LANG SYNE) گانے لگتی ہوں، تو وہ فوراً کوئی گیت شروع کر دیتے ہیں، جس میں ہجر، وفا، وصل، زخم، تیر، یا سانولیا، رسیا، جوبن، سیاں، پیاں وغیرہ لفظوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ نہ وہ میری کہی کو سُنتے ہیں، نہ میں ان کی کہی کو سمجھتی ہوں، کمرہ منارۂ بابل ہو جاتا ہے ایسے وقت میں اگر کہیں دُردانہ خانم (یہ ایک ایرانی ماما ہے جسے والد ماجد کربلائے معلٰی کی زیارت سے واپسی کے وقت اپنے ساتھ لائے تھے، اور جس نے مجھے پالا ہے) کمرے میں آ گئی اور اُس نے مجھ سے فارسی میں باتیں کرنی شروع کر دیں، تو غیاث کا چہرہ پُرغضب ہو جاتا ہے، آنکھیں انگارا ہو جاتی ہیں۔ ایک دن تو برس پڑے۔ میں لکھنے کی میز پر بیٹھی تھی، پیاس معلوم ہوئی

[1] ایک مشہور فرنگی گانے کے الفاظ۔

تو میں نے دُردانہ خانم کو آواز دی، اُس نے سُنا نہیں، مجھے غصہ آگیا، تو میں پوری آواز سے چلاّئی:

"چہار یک ساعت است متصل صدا میکنم، کسے ملتفت نمی شود، پنبہ در گوش کردند مگر؟"

وہ نہ معلوم کب کے بھرے بیٹھے تھے، کہ دوسرے کمرے سے برس پڑے، کہنے لگے:-

"یا اللہ، ہمارے کو سمجھ میں نہیں آتا، اپن طہران میں ہیں کہ لندن میں، اتنا ہم کو سمجھ میں آتا ہے کہ ہندوستان میں نہیں ہوں"۔

مَیں چُپ ہو گئی، اور سخت نادم ہوئی، مگر میرا قصور کیا تھا، خیر مگر آیندہ سے میں اُن کے سامنے دُردانہ خانم سے کبھی کسی کام کو نہیں کہتی ہوں۔

ایک دن خود لہر میں جو آئے تو دُردانہ خانم سے فارسی میں گفتگو فرمانے لگے، مگر فارسی کے گلے پر وہ کُند چُھری پھیری کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں اُٹھ کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

....

سلمیٰ! سلمیٰ! آ میرے حال زار کو دیکھ! کھانے کے بعد متواتر زور سے ڈکار لینے والے آدمی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہوں، کل جو خیال آیا تو دن بھر رویا کی، پیٹ پر ہاتھ پھیر کر "عا، عا" اونٹ کی طرح ڈکار لینا! اُف، غضب، غضب، یہ میں سوائے تمہارے کسی کو نہیں لکھ سکتی، اور اگر تم نے کوئی تدبیر نہ بتائی، تو تمہاری عذرا گھُل گھُل کر مر جائے گی ....

ایک دن نہ معلوم کس طرح ادبیات کا ذکر آگیا، پوچھنے لگے۔ تمہارے کو اُردو کا کونسا شاعر اچھا معلوم ہوتا ہے؟ یہ ایسا بیڈھب سوال تھا کہ میں بہت گھبرائی، صاف یُوں ہے کہ میں نے اُردو کی ادبیات سے بہت ہی کم فائدہ اُٹھایا ہے، میں تو یہی سُنا کرتی تھی کہ اُردو کی ادبیات بہت خراب ہیں، اخلاق بگاڑتی ہیں، مدرسے میں سوائے مولانا حالؔی کے (کہ اُن کا بھی کلام نہایت مختصر اور منتخب پڑھایا جاتا تھا) اور کسی شاعر کا نام سُنا نہیں بس میں نے بغیر اس خیال کے کہ دوسرے شاعروں سے مقابلہ کیا نہیں، یہ کہدیا:۔

"مولانا حالی کو"

"حالی کو پسند کرنے کی وجہ؟"

!!

؟؟

!!

سمجھیں؟ یعنی وہ ہمہ تن سوال تھے، اور میں ہمہ تن استعجاب"
اور اس طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

میرے پاس کیا جواب تھا کہ میں دیتی۔

آخر کہنے لگے:"میں حالی کو تو کچھ بھی نہیں پسند کرتا، ہم قافیہ نثر لکھتے ہیں۔ میرے کو "پیام یار" میں غزلیں لکھنے والے سب پسند ہیں، اور داغ کے کلام کا تو کیا کہنا، واہ واہ سب سے اچھا ہے، کیا ہجر، کیا وصل کی تصویریں ہیں، کیا معاملہ ہے، کیا چوچلا، آغا شاعر بھی بہت اچھا ہے۔"

پھر کہنے لگے:"یہ کیا بات ہے تم مدرسے میں پڑھی ہو؟ لیکن داغ کو نہیں جانتیں؟"

اس پہ مجھے بھی غصہ آگیا، اور میں نے جواب دیا:"بیشک! لیکن

آپ بھی تو شکسپیر اور ملٹن سے واقف نہیں۔"

اُنہوں نے تڑپ کر جواب دیا "میں انگریز ہوتا تو بیشک واقف ہوتا" بس اس پر ہم دونوں چپ ہو گئے، میرے ہونٹوں کو داغ نے سی دیا، اُن کے ہونٹوں پر ملٹن نے مُہرِ سکوت لگا دی۔

غرض یُوں بسر ہوتی ہے، میں تو سمجھتی ہوں کہ کسی غیر ملک باشندے کے ساتھ میری شادی ہوئی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ہندوستانی بی بی نہیں ملی۔

....

ابّا جان کی بے پروائی سے تم واقف نہیں! عجب بے پروا آدمی ہیں! اماں جانی نمایش پرست، دولت پرست ہیں۔ میں یہاں کیوں بیاہی گئی؟ اس سوال کے جواب کی غالباً اب ضرورت نہ رہی ہو گی۔

اس شادی پر جب کبھی غور کرتی ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میں کنوئیں میں دھکیل دی گئی، اور ماں نے مجھے کنوئیں میں دھکیلا، پہلے یہ ارادہ کر لیا کہ مجھے کنوئیں میں دھکیلیں گی، اور پھر

پہلا موقعہ جو اُنہیں ہاتھ آیا اُسے نہ جانے دیا اور میری پیٹھ پر ایسے زور سے دھکا مارا کہ میں سر کے بل اندر گر پڑی، زندگی کچھ نہیں؟ ہاں بیشک، مگر زندگی سب کچھ ہے؟ اس کے لئے بھی ہاں بیشک۔ بات یہ ہے کہ میں اب عقل ہی نہیں رکھتی کہ کسی چیز میں ٹھیک محاکمہ کر سکوں۔

کیا عجب بات ہے، میری سلما! کیا عجیب بات ہے کہ جس شخص کی قابلیت، حالت تربیت ایسی ہو کہ یہ کہا جا سکے کہ یہ دُنیا میں ضرور خوش قسمت اور خوش حال رہیگا۔ وہی بدبخت، ناکام، ناشاد رہتا ہے، اور آخر عمر میں اس نتیجہ کو پہنچتا ہے کہ دُنیا میں خوبی، امید و سعادت نہیں ہے، برخلاف اس کے، وہ جو ہر طرح سے ناقص ہے، ناکارہ ہے۔ بے علم ہے، وہ خوش قسمت رہتا ہے۔ اپنی زندگی میں کامران، شادمان، اور ہر طرح کی خوبی اُس کے لئے دوڑی ہوئی آتی ہے: مثلاً میں خدا کے فضل سے اچھے گھر میں پیدا ہوئی، اچھی طرح پلی، تعلیم پائی! بیاہی گئی تو سب کہتے تھے کہ کیا قسمت ہے، واہ ایسا بڑا گھرانا، ایسی بڑی ثروت، ایسی بڑی دولت

یہ لڑکی بہت خوش رہے گی۔" لیکن میں اسی حسرت میں مر رہی ہوں کہ کاش غیاث نے میری طرح اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی ہوتی، لیکن وہ ہیں کہ شام کو نوکروں پر گالیوں کی بوچھاڑ، ناٹک کے گانوں کے عاشق زار، گھوڑ دوڑ کے، اور اُس میں جُوا کھیلنے کے دلدادہ، یہ حالت دیکھ کر تمام امیدوں کا خُون ہو جاتا ہے۔

مَیں خوش قسمت ہوں یا بدقسمت؟ تمہیں ان تین مہینے کے واقعات جو میں نے تمہیں لکھے ہیں پڑھ کر بتاؤ، اور یہ بھی بتاؤ کہ میں کیا کروں، کس راستے پر چلوں، اُسے اپنے راستہ پر لاؤں یا اس دیو پر اپنی جان ضائع کر دوں۔

بعض لحاظ سے دیکھا جائے تو میرا خاوند بُرا نہیں، نہایت امیر ہے، اور چونکہ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس لئے کُل دولت کا خود ہی مالک ہے۔ حیدر آباد کے مدرسے میں کچھ دن گزارے ہیں، اس لئے پڑھ لکھ بھی سکتا ہے، اس کی شکل کی کیفیت شاید میں اوپر لکھ چکی ہوں، ویسے بھی تم نے اس خط سے اس کی تصویر ذہن میں کھینچ لی ہو گی، سراپا صحت ہے، اس قدر قوی کہ پہلوان معلوم

ہوتا ہے، آواز بھاری گویا ہاتھی پانی پی رہا ہے، بال موٹے موٹے بڑی بڑی مونچھیں، چوڑی چوڑی بھویں، باہر کو نکلی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں سیاہ اور چمکیلی اور خوفناک، اُس کے جسم و طبیعت کی تمام ہئیت مادّی ان آنکھوں میں آکر جمع ہو گئی، دن کو جب وہ باہر چلا جاتا ہے، تو بھی میں ڈر ڈر کے نفرت کر کر کے ان آنکھوں کا خیال کیا کرتی ہوں، جو مجھے گھورتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ غیاث مجھے بے انتہا بیتابی کے ساتھ چاہتا ہے اور اس محبّت سے مجھے اور وحشت ہوتی ہے، تم جانتی ہو کہ مجھے انسان کے کل اعضا میں آنکھیں بہت پسند ہیں، خدا نے اچھّی آنکھیں کچھ عجب شئے بنائی ہیں، لیکن اس کو دیکھئے کہ آنکھیں ہی مجھے نفرت اور خوف دلا رہی ہیں۔

یہ آنکھیں، یہ ڈکار، یہ آواز، یہ دونوں ہاتھوں میں مہندی لگا لے پری" کا عشق، کچھ نہیں سوجھتا کہ کہاں پناہ لُوں۔

اب اُن کی طبیعت کا حال سُنئے، نچلا خاموش کبھی بیٹھا ہی نہیں جاتا، ہر بات میں دخل در معقولات کا بے انتہا شوق ہے۔ سیاہ ابر کی طرح گھر پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے، بے انتہا

باتونی، مگر شاید میں دسویں حصّے کو بھی کان دھر کر نہیں سُنتی، کیا عمُر بھر یوں ہی زندگی گذرے گی؟ میں اس بوجھ کو یوں ہی اُٹھاؤں گی، میں ایسے خاوند کی تو تمنّا نہ رکھتی تھی، ایسا خاوند نہ چاہتی تھی، مگر انسان جو نہیں چاہتا وہی اُسے ملتا ہے۔

ممکن ہے کہ میرا جسم اُس کے جسم سے نفرت نہ کرے مگر میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، کہ میری رُوح، میری طبیعت، اُس کی رُوح، اُس کی طبیعت سے ہمیشہ ہمیشہ اور پوری پوری نفرت کرے گی۔ باقی تم سے ملنے اور تمہیں ہزار بار چُومنے اور زبانی دردِ دل سُنانے کی تمنّا۔

تمہاری

عذرا

جواب

راولپنڈی ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء

میری شریر عذرا! تم نے اپنے خط میں عقل والی عورت بننے

ئی کوشش تو بہت کی، لیکن ہر سطر سے صاف ٹپک رہا ہے:
کہ تم وہی شریر عذرا ہو۔

سب سے اوّل شادی کی دلی مبارک باد دیتی ہوں یقین
مانو، میں اپنی عمر کے چند برس اس بات پر فدا کرنے کو تیار ہوں،
کہ تمہارے سُرخ رُخساروں کو جن پر تمہارے سیاہ بال آپڑے
ہوں، دیکھوں، اُن رُخساروں کو نہیں جو مدرسے میں تھے، بلکہ اُن
رُخساروں کو جنہیں ہوائے تاہل نے اور دمکا دیا ہوگا، آہ!
پیاری عذرا تمہیں چُومنے، دیوانہ وار چُومنے کی اور تم سے
چومے جانے کی تمنّا رکھتی ہوں، لو میں نے کاغذ پر اِس جگہ
(   ) کو چوما ہے اور میں
خیال کرتی ہوں کہ میری رُوح محبّت کا ایک ٹکڑا، اس جگہ
چپک کے رہ گیا ہوگا، اس مقام کو تم بھی چُومنا، تاکہ اسی طرح
سے میرے ہونٹ تمہارے ہونٹوں سے ایک جگہ ملیں، اور میری
رُوح کو مسرّت پہنچے۔

تم نے اپنے خط میں کیا کیا لکھ ڈالا ہے۔ تمہارے خیالات تیے

(معاف کرنا بعض اُن میں سے پراگندہ ہیں) تو مجھے حیرت میں ڈال دیا، تم نے خذف اور الماس کو خوب ملایا ہے۔

تمہارا خط پڑھتے وقت مَیں کسی قدر ہنسی ہوں۔ میری شوخ، شاطر عذرا! اُسی پھڑک، اُسی بھڑک، اُسی چنچل پن سے میری آنکھوں میں پھر گئی، وہی عذرا جو اپنی شرارتوں، اور ہٹوں سے کبھی مجھے غصّہ دلا دیا کرتی تھی، اور کبھی بے تحاشا ہنسا دیا کرتی تھی۔

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں صرف ہنسی ہی ہنسی، یا میں تمہارے خط کو لااُبالی تحریر سمجھی، نہیں مجھے اس خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم نے حقیقت میں اپنا دردِ دل لکھا ہے، اور اِس لئے میں نے تمہاری تحریر پر جدّاً نظر ڈالی اور کئی دن تک اسی کے متعلق سوچتی رہی، تمہاری اور اپنی حالت کا موازنہ کرتی رہی، میری اور تمہاری تربیت میں بہت ہی کم فرق ہے، ہم دونوں نے ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پائی، لیکن ہاں چونکہ میرے والد خود شاعر اور اُردو کے بڑے حامی اور دلدادہ تھے، اِس لئے

کچھ اُن کی کوشش سے، کچھ اپنے شوق سے، مجھے اردو میں تم سے زیادہ مصروفیت رہی اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی تو تمہارے برابر نہیں جانتی، مگر اُردو ضرور تم سے زیادہ جانتی ہوں، بولنے میں نہیں، کیونکہ تمہاری رواں اور پیاری زبان وہ بھی دلّی کی کہاں سے لاؤں، ہاں لکھنے میں، کیوں کہ والد کے مضامین، اور اُن کے کتب خانے کی کتابیں اکثر پڑھتی رہی ہوں، اِس لئے طبیعت تحریر کی اُردو سے آشنا ہو گئی۔ پیانو، موسیقی، نقاشی، اس میں ہم دونوں برابر ہیں، پھر بیاہ کا زمانہ آیا، قسمت نے بیاہ کے قرعہ میں میرے نام کے ساتھ، ولایت کے پاس شدہ انجینر، مسٹر حامد کا نام نکال دیا، تمہارے نام کے ساتھ نواب غیاث الدین کی چٹھی نکلی، اور ہمارے ماں باپوں نے ہمیں اپنی آغوشں سے جُدا کر کے اُن لوگوں کے پہلو میں پھینک دیا۔

دل چاہتا ہے کہ اس مسئلہ ازدواج پر کچھ تھوڑا سا وعظ کہوں، پہلے بیاہ شادیوں میں کیا دیکھا جاتا تھا یہی نا کہ برہم کُف ہے یا نہیں،

ایک برادری کا ہے یا نہیں، اس کُف اور برادری پر سب چیزیں قربان کردی جاتی تھیں۔ پھر اصلاح ہوئی، کُف کا خیال ترک کردیا گیا، تعلیم کا زور ہوا "بر، تعلیم یافتہ ہونا چاہیئے، تعلیم یافتہ ہونا چاہیئے" کا شور بلند ہوا، تھوڑے دنوں کے بعد اخلاق کی بھی چھان بین ہونے لگی، بس یہاں پہنچ کے اصلاح رخصت ہوئی، گویا اب کوئی کام باقی نہیں رہا، لیکن مجھ سے پوچھو تو کوئی کام ہوا ہی نہیں، اصلی اصلاح تو جب ہے، جب لڑکے لڑکی کے مزاج، اور طبیعت کی مناسبت کی پوری چھان بین کی جائے، خاوند اور بیوی دوہرے کپڑے کی ابرہ، استر ہیں ابرہ، استر کے رنگ کی مناسبت کا کتنا خیال کیا جاتا ہے، یہ نہیں کہ دونوں ایک ہی رنگ کے ہوتے ہوں، نہیں، یک رنگی میں کوئی زینت نہیں، خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ایک رنگ دوسرے سے جوڑ کھاتا ہو۔

بس اسی طرح، لڑکے لڑکی کے مزاج کا خیال لازمی ہے، امتزاج کے اسباب موجود ہیں یا نہیں، طبیعتوں میں ایسا بیّن تضاد

تو نہیں کہ میل کھانا مشکل ہو، میرے نزدیک تو سب سے زیادہ اہم یہ سوال ہیں، حُسن و جمال، مال و دولت، تعلیم و تربیت سب کو میں دوسرے درجہ پر رکھتی ہُوں۔

شاید تمہاری طبیعت اس وعظ سے گھبراتی ہوگی، میں معافی چاہتی ہُوں، میں اس بحث کو ترک کئے دیتی ہوں۔ مگر کیسے ترک کروں، آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم جیسے میں ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ مزاج میں سنجیدگی نہیں، الّھڑ ہے اور میں جسے تم ہمیشہ خیال پرست (SENTIMENTAL .) شاعر مزاج کہا کرتی تھیں، ہم دونوں ایسے خاوندوں کے پالے پڑے کہ ان لوگوں کے ساتھ شادی نہ ہوئی ہوتی، تو چاہے یہ بھائی ہی ہوتے۔ ہم اُن کے پاس دس منٹ بیٹھنے سے گھبراتے اور شاید وہ لوگ ہمارے لئے ایسا ہی خیال رکھتے ہونگے۔ یہ عدالت ہے، یہ انصاف ہے؟ کہو "ہاں" سوائے اس کے اور کچھ کہنا منع ہے، لیکن اس تضاد کا سبب کون ہے؟ ان خرابیوں کا جواب دِہ کس کو قرار دینا چاہیئے؟ میں تو بلا پس و پیش

کہتی ہُوں، ہمارے ماں باپوں کو۔

اگرچہ خط لمبا کرکے تمہیں پریشان کروں گی لیکن میں بھی تمہیں اپنی زندگی کا مرقع دکھاتی ہُوں، مسٹر حامد کیسے آدمی ہیں؟ اُن کے حسیات، اور خیالات کیا ہیں؟ افکار کیا ہیں؟ اُن کے حسیات اور خیالات یہ ہیں: (۰ × ۰ = ۰)

آہ تم ایسا خاوند چاہتی تھیں، جو رات دن تمہارے ساتھ ہنسا کرے، تمہارے کھیلوں میں شریک ہوا کرے، مجھے ایسے شوہر کی تمنّا تھی، جو کسی باز کے پنجہ میں پھنسی ہوئی چڑیا یا کسی پژمردہ گُل کو دیکھ کر میرے ساتھ روئے، میرے ساتھ ہردم عالمِ خیال میں رہے۔

حال یہ ہے کہ مسٹر حامدؔ، جب رات کو گھر میں تشریف لاتے ہیں، تو اس خوف سے کہ کہیں اُن کی نیند نہ اُڑ جائے، میری باتوں کا جواب بھی نہیں دیتے، (اگر کسی دن تعطیل کے ایّام میں) گھر میں کچھ ٹھہرے بھی، اور میں نے اُن کی خاطر کچھ بجانا شروع کیا، تو وہ فوراً آرام کرسی پر بیٹھ کر سونا شروع کر دیتے ہیں، اُن کے اوقات کا نقشہ تمہیں لکھتی ہُوں :—

سونا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹ گھنٹے

سرکاری کام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷ گھنٹے

سیر و تفریح و ریاضت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶ گھنٹے

گھر میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲ گھنٹے

میزان ۲۴

ذرا دیکھنا ؟ ۲۴ گھنٹوں میں دو گھنٹے مجھے دیتے ہیں کہ اس حساب سے سال بھر میں میری اُن کی ملاقات صرف ایک مہینے ہوتی ہے، لیکن یہ یاد رہے کہ ان دو گھنٹوں میں گھر کے معاملات، بچّوں کا دیکھنا بھی شامل ہے، غرض کہ مسٹر انجینیر نے یہ حساب پورا پورا بنا رکھا ہے، اور اس پر بہت باقاعدہ عمل ہوتا ہے۔

عذرا! تمہیں بھی قسم ہے، اس تقسیم اوقات کے متعلق ذرا اپنی رائے دینا۔

گھر کے تمام انتظامات اور معاملات میرے متعلّق ہیں، خانہ داری کے متعلق وہ کسی چیز میں پھنسنا نہیں چاہتے ہیں، جو چاہوں کروں، مجھے پوری آزادی ہے، بچّوں کو پالوں، یا مار ڈالوں

گھر تبدیل کردوں، اسباب بیچ ڈالوں، اور خرید لوں، نوکروں کو مقرر کروں، برخاست کردوں، غرض کہ جو چاہوں کروں، مختار رہوں۔

وہ گھر کو ہوٹل سمجھتے ہیں، اور کھانے پینے اور سونے کے لیے یہاں آتے ہیں، ان تین باتوں کے انتظام میں وہ دخل نہیں چاہتے، اگر میں بیمار بھی پڑ جاؤں، تو اُن کے مقرّرہ اوقات میں فرق نہیں پڑتا، خود طبیعت ناساز ہو تو ظاہر ہے کہ اس دستور العمل میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

کم سخنی کا وہ عالم ہے کہ بات اُن کے دہاں موزوں سے اوّل تو کم نکلتی ہے اور جب نکلتی ہے تو تُل تُل کے رتّی رتّی نکلتی ہے میری تعلیم و تربیت معمولی تعلیم و تربیت نہ تھی، مدرسے کے علاوہ گھر پر بھی مجھ پر تربیت کی بوچھاڑ رہی، گورنس اور کیا، اور کیا، سب سے گھری رہی، پھر دُلہن بنی، اور ایسے شخص کو سونپی گئی، جو بڑا تعلیم یافتہ، سات سمندر پار سے پڑھ کے آیا تھا، اور اللہ! کن کن امیدوں کے ساتھ، میں اپنے خاوند کے

پاس گئی پُہنچی تو عالم کچھ اور ہی پایا! کیا عالِم امید اور عالم حقیقت، عالِم خیالی اور عالِم اصلی میں ہمیشہ اتنا فرق ہوتا ہے؟

حامد نے تمہارے خاوند کی طرح ہر دم میرے ساتھ رہنے سے مجھے پریشان نہیں کیا، بلکہ وہ آزادی دی، جس سے میرے حق میں بے پروائی کی بو نکلتی تھی۔

تم جانتی ہو میں ایسی بدشکل تو نہیں، میری ملاقاتیں اور آئینہ اس کی شہادت دیتے ہیں، جب یہ بات ہے تو کیوں میں اپنی تعلیم و تربیت و حُسن کے شایاں، باکمال عفت زندگی بسر نہ کروں؟ کیوں میری قسمت میں یہ بے پروائی لکھی ہوئی ہے؟ اسے سوچتے سوچتے میں کبھی چلّا اُٹھتی "اگر یہی بے پروائی ہے، تو میں بھی ناولوں کی سی زندگی شروع کیوں نہ کر دوں" "یہ شخص جو میری تحقیر کرتا ہے اُس کا جواب تحقیر سے دوں"، میری معنویات، اور میری مادّیات میرا بازو پکڑتے تھے، اور ایک اپنی طرف کھینچتی، اور دوسری اپنی طرف، آدھی رات تک اپنے خاوند کا انتظار کرتے ہوئے اپنی لڑکی کو تھپکاتی ہوئی، اس کشمکش میں رہا کرتی تھی، میں

سوچتی تھی، کہ میں اپنے خاوند کی اسیر، اس کی باندی ہو سکتی ہوں مگر اُس کی طرف سے باندی کرنے کی کوشش تو دیکھوں وہ کیا؟ فداکاری، محبّت، مگر اس کا وہاں نام و نشان تک نہیں تھا، شاید میں نے پڑھا لکھا نہ ہوتا تو یہ خیالات میرے ذہن میں نہ آتے، شاید میری نظر سطحی ہوتی، اور اس لئے میں زیادہ متحمّل، زیادہ صابر ہوتی، شاید میرے ذہن میں نہ آتا کہ حقارت کا مقابلہ حقارت سے کیا جا سکتا ہے، شاید میں یہ بھی نہ سمجھتی کہ میری حقارت کی جا رہی ہے (مگر نہیں تعلیم نہ پاتی تو اور بھی زیادہ وحشی ہوتی، سوچنے، موازنہ کرنے، اور طبیعت کو روکنے کا مادہ نہ ہوتا) -

ایک روز ایک عورت اپنا دُکھڑا سُنا رہی تھی، میں نے ہمدردی کے طریقہ سے کہا "صبر کرو، صبر اچھی چیز ہے" وہ شکایت آمیز آواز سے کہنے لگی "بیشک، صبر، مگر صبر کے بعد قبر" سوچتی ہوں تو اُسے صحیح پاتی ہوں، انسان دو مرتبہ دُنیا میں نہیں آتا، شباب عود نہیں کرتا، فرض کرو کہ یہ بے اعتنائی میری طرف سے ہوتی تو کیا اُنہیں شکایت کا موقع نہ ہوتا-

یہ باتیں تمہیں لکھ رہی تھی، کہ میری چھوٹی لڑکی جمیلہ دوڑی دوڑی میرے پاس آئی اور اپنی پیاری پیاری، ننھی ننھی آواز سے کہنے لگی:۔ امّاں جان! آج تم نے مجھے چوما نہیں" اور یہ کہہ کر کرسی پر چڑھ کر میری گود میں آبیٹھی، اور اُس نے تمام میری دل کی جراحتوں پر مرہم کا کام دیا۔ عذرا! پیاری، خدا تمہیں بھی بال بچّہ دے، اولاد بڑی نعمت ہے، ساری دُنیا کے غم اُس کے سامنے بھاگ جاتے ہیں، اپنی بچیوں کو دیکھ کر یہ زندان، مجھے بہشت معلوم ہوتا ہے، یا میں اپنے تئیں ایک باغ تصوّر کرتی ہوں، جس میں یہ پُھول کھل رہے ہیں، جُوں جُوں پُھول کھلتے ہیں، باغ کی مسرت بڑھتی جاتی ہے۔

پیاری عذرا، میں دیکھتی ہوں کہ علم میں میرا خاوند چاہے مجھ سے بڑھ کر ہو چاہے میرے برابر، ایک بات میں تو قطعی طور پر میں اُس سے بڑھی ہوئی ہوں، اور وہ بات محبّت اور شفقت ہے، میں اپنی بچیّوں کو چُومتے وقت اپنی محرومیت اور اپنی بدنصیبی سب بھُول جاتی ہُوں، حالانکہ میں شفقت، اور محبّت کا نشان

تک نہیں۔ اُس نے نہ اُقلیدس میں اُسے پڑھا، نہ جبر مقالہ میں اس لفظ کو دیکھا، آج ان لڑکیوں کو لے کر چلی جاؤں، تو اگر میری ضرورت اُسے نہ ہو تو کبھی بھول کر بھی لڑکیوں کا خیال نہ کرے، میں نے ابھی کہا تھا کہ یہ حُسنِ شفقت میرے لئے اپنے خاوند پر تفوق کا باعث ہے، لیکن غور سے دیکھو، تو یہی تفوق میری اور کُل عورتوں کی ذِلّت کا باعث ہوتا ہے۔

حامد کو گھر میں اگر کسی چیز سے دلچسپی ہے تو اس سے کہ لڑکیوں کو نقشہ کشی سکھائے، کسی دن، تعطیل کا پُورا دن اس میں صرف ہو جاتا ہے، بڑی لڑکی سعیدہ ابھی سال بھر ہُوا علی گڑھ مدرسۂ نسواں میں بھیج دی گئی، وہاں لوگوں نے اس کی نقشہ کشی اور مصوّری کی لیاقت دیکھ کر بہت تعجّب کیا۔ کبھی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے جا کر انہیں بائیسکل پر چڑھنا سکھاتے ہیں۔

مَیں دُعا کرتی ہوں ان دونوں لڑکیوں کی قسمت میری سی نہ ہو۔ یہ تصویر کھینچنے والی، بائیسکل پر سوار ہونے والی لڑکیاں ساکن

وراکڈا اور ٹھوس طبیعت والے خاندان کے پالے نہ پڑیں۔

بارہ برس سے میں حامد کی بی بی ہوں، مجھے تو یاد نہیں پڑتا مکانوں کے نقشے اور کھیلنے کے تاش کے علاوہ کوئی کاغذ میں نے اُن کے ہاتھ میں دیکھا ہو، نقشے کھینچنا، ایک، تاش کھیلنا، دو، یہ اُن کے شغل ہیں، کبھی کوئی بحث، کبھی کوئی بات، جس سے دل میں حرکت، دماغ میں چمک پیدا ہو، میں نے اُن سے نہیں سُنی، اُن سے ملنے دوست بھی آتے ہیں، تو چپکے چپکے تاش کھیل گے چلے جاتے ہیں۔ دُنیا میں انہیں کسی چیز کے متعلق جوش نہیں آتا۔ ان دو مشغلوں کے علاوہ دُنیا کے کسی واقعہ کا اُن کے دماغ میں گزر نہیں ہوتا، اُن کھیلوں، ان شغلوں کو بھی مقرّرہ اوقات میں کرتے ہیں، غرضکہ اُن کا فلسفۂ حیات دنیا میں نباتات کی طرح خاموش زندگی بسر کرنا ہے، ہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ زندہ ہیں، کبھی کبھی تاش کھیل لینا ہے۔

وہ دن نہ بھولونگی، کئی برس ہوئے، اس سکوتِ مطلق سے عاجز آ کر میں ایک دن اُن سے خوب لڑی، اس طرح:۔

اُس ٹھہرے پانی جیسی زندگی سے تو میں اُکتا گئی، خدا کے لئے کچھ حرکت کرو، کوئی بات کہو، اور نہ سہی مجھ سے لڑو، شور مچاؤ، مجھے معلوم تو ہو کہ تمہاری رگوں میں خون دوڑتا ہے، اور میں ایک مرد کی رفیقہ ہوں، جاؤ کسی بیگانی عورت سے محبّت کرو، تاکہ اس حالت کو دیکھوں، اور اُسی طرح اس یک رنگ، یک آہنگ زندگی میں کچھ فرق آئے، ورنہ یہ مکان قبرستان سے بدتر ہو رہا ہے۔ یہ موت جیسی زندگی کب تک رہے گی، اچھّا یہ نہیں تو آؤ مجھے مارو، میرے بال نوچو، آؤ کچھ تو کرو، میں کیا کیا تمہیں سُنا رہی ہُوں، سُنتے ہو، سمجھتے ہو، کہ نہیں"......

میں اس چیخنے چلاّنے سے تھک کر چپ ہو رہی، مگر اُن کی طرف سے کوئی جواب نہ تھا، نہ استہزاء، نہ غُصّہ، نہ حدّت کہا تو یہ کہا (وہ بھی نہایت آہستہ سے) "ذرا میرا کوٹ لا دیجئے جمیل کے ہاں جانا ہے، اُن سے آج تاش کھیلنے کا وعدہ کیا تھا،" یہ کہہ کے باہر چلے گئے۔ میں کرسی پر گر پڑی اور بڑی دیر تک رویا کی۔

ساتھ اس کے یہ خیال رہے، وہ میری کسی طرح کھُلی کھُلی تحقیر، تذلیل نہیں کرتے، کبھی "تم" کا لفظ میں نے اُن کی زبان سے نہیں سُنا، ہمیشہ "آپ" کا استعمال کرتے ہیں، نہایت عزّت اور احترام کا برتاؤ کرتے ہیں۔

لیکن یہ احترام کچھ مخصوص احترام نہیں، طبیعت کی اُفتاد اسی طرح ہوئی ہے، گویا ایک کل کا آدمی ہے جسے اسی طرح کی کوک ملی ہے، اور اُس کوک کے مطابق چل رہا ہے۔

باہر والے ہمیں سمجھیں گے کہ ہماری زندگی بڑی اچھی اور قابلِ رشک زندگی ہے، لیکن اگر اس پوشیدہ حقیقت کو دیکھیں تو......

پیاری عذرا! تم نے اپنے خاوند کے حالات میں لکھا ہے، "خاموش نہیں بیٹھا جاتا، ہر بات میں دخل دیتا ہے، حرص بھری نظروں سے مجھے دیکھتا ہے، وغیرہ وغیرہ" میں اس کے جواب میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں، اس کی لالچی نظریں، غرورِ نسوانی کے لئے غذا ہیں، میں تم سے کہتی ہوں، خوشی خوشی زندگی

بسر کرو تمہاری اور تمہارے خاوند کی تربیت میں اختلاف ہے
مزاج میں تھوڑا سا اختلاف ہے، مگر نہ اتنا کہ کوشش کر کے ایک
دوسرے کے موافق نہ ہو جائے پس اُس کے ساتھ ہنسی خوشی بسر کرو،
تمہارے خاوند کی ایک زندگی تو ہے، کچھ پرواہ نہیں اگر وہ
شور مچاتا ہے، ڈکار لیتا ہے، ناٹک کے گانے گاتا ہے، یہ
باتیں اس قدر تحمّل فرسا نہیں، جیسی میرے گھر کی بے حرکت بے مآل
زندگی۔ میں ان احترامات کی کیسی برداشت کروں، تمہیں یاد ہو گا
شادی سے پہلے میں کہا کرتی تھی کہ مَیں اپنے خاوند پر حکم کیا کرونگی،
اُس کی آمر مُجبر ہونگی، لیکن اب دیکھو میرے تمام خیالات
بدل گئے۔ میں چاہتی ہوں وہ میرا احترام کرے نہ کرے لیکن
مجھ سے اپنا احترام کرائے، اور دل میں ایسا گھر کرلے کہ
چاہے مجھے اذیّتیں دے لیکن میں اُس کی مطلوب مشتاق رہوں،
اُن اذیّتوں سے لذّت اُٹھاؤں۔

اُف! اُستسان، بے صدا جینا کچھ جینا نہیں، اُردو کا شکسپیر،
غالب، کیا صحیح کہہ گیا ہے:۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

سکون کی خواہش ہے تو اُس کے لئے قبر موجود ہے۔ مرنے سے کوئی روکتا نہیں، یہ سمجھ لو کہ فکر کی لذّت، خیال کی لذّت، شور و شغب کی لذّت سے بڑھ کر ہے، مگر نہ حِس نہ حرکت، نہ عالمِ خیال میں میرے ساتھ شرکت، نہ عالمِ وجود میں میرے ساتھ شرکت! اس کو زندگی کہتے ہیں؟

باقی تمہاری پیاری آنکھوں، تمہارے سیاہ بالوں، تمہارے سُرخ گلگوں رُخساروں سے، اشتیاق اور حسرت کے ساتھ لاکھوں کروڑوں بوسے لینے کی آرزو۔

تمہاری مفتون
سلمیٰ

حضرتِ دل کی سوانح عمری

مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ اپنی سوانح عمری لکھوں، اس میں شک نہیں کہ میرے حالات فائدے سے خالی نہ ہونگے لیکن مشکل یہ ہے کہ میرے سوانح، میری کیفیات، میری زندگی کی صعوبات لوگوں کو یا تو یقین نہ آئیں گی یا سمجھ میں نہ آئیں گی۔ مثلاً ایک چھوٹی سی بات لیجئے:- میں اثر پذیر بہت ہوں، خدا نے بے شمار مخلوق پیدا کی ہے، اور اس بے شمار مخلوق میں میں ایک ناچیز مختصر چھوٹی سی شے ہوں، لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں

اور یہ حکایت امرِ واقعی ہے (کچھ فخر نہیں) کہ اس تمام مخلوق میں کوئی مخلوق نہیں جو میری برابر متاثّر ہوتی ہو اسے کون یقین کریگا؟

پھر میں ہر چھوٹی بڑی شے سے متاثر ہوتا ہوں، نئی پرانی قُدرتی، مصنوعی، ظاہری، باطنی، صُوری، معنوی، جان دار، بیجان غرضکہ کوئی چیز ہو مجھ پر اثر کرنے کے لئے کافی ہے، لیکن آپ سے سچ کہوں اور سچ ہی کہونگا، یا تو سوانح عمری لکھونگا نہیں، یا لکھوں گا تو سچائی سے منحرف نہ ہوں گا، کوئی چیز مجھ پر اتنا اثر نہیں کرتی جتنا ...... میں کیسے کہوں آپ شُبہ کریں گے ......

جتنا ...... جتنا ...... نا ...... حُسن

میری بساط مُٹھی بھر کی بھی تو نہیں، لیکن حسین چیز دیکھی اور بیتاب ہو گیا۔ بانسوں اُچھلنے لگتا ہُوں، دھڑکنے لگتا ہُوں، میں کسی سینے میں ہوں، اور وہ سینہ کسی لباس میں ہو، عبائے تقویٰ و زہد میں جامۂ رندی و خراباتی میں، عالم و ادیب کے چوغے میں، یا رئیس کے زردوز لبادے میں، غرض میں کہیں چھپا ہُوں وہ چیز جسے حُسن کہتے ہیں، میرے سامنے ہوئی اور

مَیں ازخود رفتہ ہو گیا۔

ایک اور بات ہے جس سے میں اپنے حالات لکھتے ہوئے ہچکچاتا ہوں، میں نے اس دُنیا میں آرام نہ دیکھا، تکلیف اور درد میری قسمت میں تھا، گھُلنا، ٹکڑے ہو ہو جانا میرے نصیب میں تھا۔ اس وسیع دُنیا میں ہر شے عیش میں ہے اور نہیں ہوں تو میں۔ وجہ اس کی کیا ہے؟ یہی کہ اور جتنی چیزیں ہیں وہ اُس چیز سے (اُسے نعمت کہوں یا مصیبت؟) بَری ہیں جس سے میرے رگ و ریشہ کی ساخت ہے۔ یعنی میں متحسّس ہوں وہ نہیں ہیں۔

۲۔ سب سے پہلی حسین چیز جو مجھے یاد ہے اور جس کا خیال اب تک مجھ پر اثر کرتا ہے۔ وہ وہ شفقت اور رقت، رُوحانیت وانسانیت کی دیوی ہے جسے ماں۔ معاف کیجئے مَیں اب کچھ نہیں لکھ سکتا، اس لفظ کے آتے ہی میں دھڑکنے لگا! دھڑکوں تو لکھوں.... کہتے ہیں حُسن میں نے سینکڑوں طرح کے دیکھے اور سب میں کشش پائی، لیکن جتنی کشش اس حسین اور نرم شے

میں دیکھی کسی میں نہ دیکھی۔

قدرت کی یہ سب سے نرم اور شفیق چیز مجھے بہت ہی پیاری معلوم ہوتی تھی، اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں اُس کے پیارے چہرے کو دیکھنے کے لئے رو رہا ہوں اور مجھے گود میں اُٹھا لیا گیا ہے اور یہ خیال کر کے کہ میں بھوکا ہوں مجھے دودھ پلایا گیا ہے حالانکہ اس کی بالکل ضرورت نہ تھی، میں بس اس کو دیکھنے، گھنٹوں اُس فرحت بخش، طمانیت بخش، محبت پاش، اُلفت انگیز چہرے کو.....

اُس چہرہ کو جو مجھے عالم لاہوتی کی صورتوں کی جنہیں میں ابھی چھوڑ کے آیا تھا، یاد دلاتا تھا، دیکھنے کا خواہشمند تھا، کبھی میں اس حسین شے کے سینے سے لپٹنے کی خواہش کرتا تھا، لیکن کہہ نہیں سکتا تھا، صرف ہمکتا تھا، اور وہ حُسن کی دیوی، وہ شفقت و رُوحانیت کی پری، خدا ہی جانتا ہے میری خواہش کو کس طرح سمجھ لیتی تھی اور مجھے سینے سے لگا لیتی تھی، اور اس وقت وہ خوشی محسوس کرتا تھا جو دُنیا کی تمام خوشیوں سے بالاتر ہے۔ میں جب اُس کے سینے سے لگتا تھا تو مجھے معلوم ہوتا تھا اور یہ معلوم ہو کے مجھے کیسی خوشی

ہوتی تھی کہ میں اُس کے سینہ میں بھی دھڑک رہا ہوں۔ وہاں بھی تڑپ رہا ہوں۔

دوسری حسین اور خوبصورت چیز جس نے مجھے اپنی طرف کھینچا وہ شمع تھی۔ یہ نورِ عُریاں مجھے گھنٹوں محوِ حیرت رکھتا تھا۔ اور کہیں قریب ہوا تو میں اُس سے ملنے کے لئے اُس سے لپٹنے کے لئے بے اختیار اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔

لیکن یہ کیا؟ مجھے روکتے تھے۔ کیوں؟ کیوں مجھے اُس حسین شے سے ملنے نہیں دیتے تھے؟ اِس لئے کہ پہلے کی طرح ہر حسین شے شفیق نہیں۔ یہ حقیقت، یہ دل شکن حقیقت مجھے بعد میں معلوم ہوئی، اچھا ہوتا اگر جب ہی معلوم ہو جاتی۔

چاند۔ وہ بیجان مخلوق میں سب سے زیادہ طرب انگیز چیز یعنی چودھویں رات کا چاند۔ تو مجھے بالکل بیتاب کر دیتا تھا۔ اُسے بھی پکڑنے، اس سے بھی ملنے کی خواہش ہوتی تھی، میں اُسے اپنے پاس اپنی طرف متوجہ سمجھتا تھا، سب کہتے تھے "دیکھو دیکھو، کیسا ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے، آنکھ بھی نہیں جھپکتی"

میں اُسے دیکھ دیکھ کے کھِل کھلا کے ہنس پڑتا تھا، کیونکہ اُسے میں اپنی طرف مائل پاتا تھا، اور پھر اُسے پکڑنے لئے ہاتھ بڑھاتا تھا۔ مگر آہ چاند دُور تھا۔ حُسن دھوکا بھی دیتا ہے۔

بس یہ زمانہ میری خوشی کا زمانہ تھا، میں حسینوں سے گھرا رہتا تھا، ہوا میں پریاں میرے پاس آیا کرتی تھیں اور مجھ سے باتیں کیا کرتی تھیں، اور لطیفے کہہ کہہ کے مجھے ہنساتی تھیں۔ فرشتے ایک زریں سیڑھی پر آسمان سے اُتر کر میرے پاس آتے تھے مجھ سے سرگوشیاں کرتے تھے اور مجھے گُدگدا کے بھاگ جاتے تھے۔ سیڑھی پر سے چڑھنے اور اُترنے کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور میں انہیں دیکھا کرتا تھا گھر میں حسین، پاکیزہ، اور باعصمت عورتیں مجھے گھیرے رکھتی تھیں، میں جس گود میں چاہتا جاتا، اور خوشی خوشی، قبول کیا جاتا تھا، جس کے گالوں پر چاہتا ہاتھ پھیرتا اور سب ہنستے تھے، جس کا چاہتا بوسہ لیتا، اور سب مجھے چُومتے تھے۔

۳- اس پہنائے زندگی میں۔ میں نے چند قدم اور ڈالے۔ اب رنگ برنگ کی تیتریاں مجھے اپنی طرف کھینچتی تھیں، میں

اُن کی طرف دوڑتا تھا، اور وہ اُڑ جاتی تھیں، حُسن کی بے اعتنائی دیکھی؟

ایک دن ایک پاک، سفید و براق کبوتر میرے ہاتھ میں آ گیا! مَیں فرطِ محبت سے اُسے بھینچتا تھا، اُسے چُومتا تھا، لیکن وہ پھڑپھڑا کے اور میرے ہاتھوں سے اپنے تئیں چُھڑا کے اُڑ گیا۔ حُسن قدر ناشناس ہے!

ابھی میں کم عمر ہی تھا کہ مجھے ایک خوفناک حقیقت معلوم ہوئی، ہم چند نو عمر دل زمین پر بیٹھے ہوئے کھیل رہے تھے، لڑکے بھی تھے، لڑکیاں بھی تھیں، مٹی کے گھروندے بنا رہے تھے، میرے پاس ایک حسین شاطر لڑکی بیٹھی تھی، ہم گھروندے بھی بناتے جاتے تھے، اور آپس میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے، نہ معلوم اُس نے کونسی ایسی بات کہی کہ مجھے بہت ہی بھلی معلوم ہوئی اور میں نے اُس سے بے اختیار ہو کر ایک بوسہ مانگا، یا تو وہ مجھ سے ایسی گھُل مِل کے باتیں کر رہی تھی، یا اس سوال سے ایسا مزاج برہم ہُوا، اور اُس نے مجھے ایسے زور سے جھڑکا، اِس شدت سے

ڈانٹا کہ میں کانپ اُٹھا، اور اب بھی جب خیال آتا ہے تو وحشت زدہ ہو جاتا ہوں۔ اللہ رے حُسن، تیرا غرور! لیکن نہیں، صنعتِ خالق میں، عورت کے سوا سب سے زیادہ پیاری صنعت، پھُول، سے مجھے شکایت نہیں، اُس نے مجھ سے اجتناب نہیں کیا، بلکہ میری ہی طرف سے اُس پر زیادتی ہوئی۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھے توڑے، میں اُسے توڑتا تھا، پھول کبھی دل شکن نہیں ہُوا، میں اکثر گلچیں بنا۔

کہا جاتا ہے کہ میں رئیس اعضا ہوں، خاک بھی نہیں! اگر میں رئیس اعضا ہوں، تو مثلاً میں جب اُس حُسن کی دیوی کو دیکھ کر غش ہو جاتا ہوں اور حکم کرتا ہوں: "چلو اُس کی پرستش کریں، اُس کے قدموں پر اپنے تئیں ڈال دیں" کیا ہوتا ہے، میری ریاست دھری رہ جاتی ہے، رئیس اعضاء کی کوئی نہیں سُنتا۔ دماغ (وہ مشیر با تدبیر جن سے خدا سمجھے، جنہیں "مصلحت نہیں" "بری بات ہے" کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں) فرمانے لگتے ہیں: "بُری بات ہے، عیب کی بات ہے، لوگ کیا کہیں گے، مانا کہ تم بُرے

خیالات سے پاک ہو، لیکن دُنیا پر کیسے ثابت کرو گے"، پاؤں زمین میں گڑ جاتے ہیں، میں دہل پس کے اور غصّے میں خُون ہو کر رہ جاتا ہوں۔

ابتدائے آفرینش عالم سے اب تک لاتعداد تجربے میں نے کئے اور بیشمار اشخاص سے پالا پڑا، کسی کو دوست پایا، کسی کو دشمن، کسی کو اپنی طرف سے بے پروا۔

اُنہیں جنہوں نے مجھے اپنی طرف کھینچا ہیں کبھی بھُولوں گا تھوڑا ہی۔ نجد میں مجھے لیلا نے بہت پریشان کیا۔ ایران میں شیریں کے ہاتھوں میں بہت بھٹکا۔ مگر آہ! شکنتلا! شکنتلا وہ مجھ پر مہربان تھی۔ لیکن ادھیلن! تو بے پروا تھی اور کیسی بے پروا کہ لاکھوں خلق خُدا کا خُون کرا گئی۔

سوانح عمری میں حقیقت سے گریز نہ کرنی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض کو میں نے بھی تباہ کر دیا۔ جو ناچ چاہا انہیں نچایا قیس عامر کا جب خیال آتا ہے تو میں بہت ہی کُڑھتا ہوں فرہاد کی زندگی تلخ کر دی، ہند کے بادشاہ جہانگیر کو بھی میں نے

بہت ستایا۔

یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں ظلم اور سختی سے (جو معنوی بدصورتی ہے) میری ازلی دشمنی ہے اور حد سے زیادہ تعقّل سے مجھے نفرت ہے یہی وجہ ہے کہ بیکن بوعلی سینا ابن رشد، اقلیدس، نپولین، تیمور اور چنگیز کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں، لیکن جہاں یہ میرے دشمن تھے وہاں میرے مداح، رفیق، میرے دوست بھی ہوئے ہیں شکسپیر کو میں نہ بھولوں گا، کالی داس حافظ، اکبر کبیر کی یاد مجھ میں ہمیشہ تازہ رہے گی یہ میرے دائمی دوست تھے اور سچے دوست تھے[لے]

۵۔ میں نے مشرق اور مغرب میں جو سفر کیئے ہیں اور جو تجربے اور واقعات نظر سے گذرے ہیں وہ بھی نہایت حیرت خیز ہیں۔

لے یہ نہ خیال کیجئے کہ میرے دوست یا دشمن اگلے زمانہ ہی میں ہوئے۔ اب نہیں ہیں اب بھی ہیں مگر میں نام نہیں لیتا مثال کے طور پر دو ایک نام گنائے دیتا ہوں، دشمنوں میں میرے دشمن لارڈ کچنر بہادر ہیں اور ایڈیٹر عصر جدید۔ دوستوں میں دوست میرے پیارے دوست اقبال ہیں جنکا ایک شعر مجھے بہت بھاتا ہے اور اس کے لئے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں سے

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل ۔۔۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

سب سے پہلے مجھے یہ کہنا ہے کہ مشرق ہو یا مغرب، یورپ ہو یا ایشیاء، میں نے ہر جگہ، ہر جگہ بدنظمی، ہر جگہ لٹیروں، قزّاقوں کو درپے آزار دیکھا۔

مشرق بالخصوص ہندوستان سے مجھے بہت شکایت ہے۔ مجھ پر چاروں طرف سے حملے ہوتے ہیں، لیکن کس طرح؟ دلیرانہ سامنے اگر حملے نہیں کئے جاتے، بلکہ گاڑی کی جھلملیوں میں سے جھروکوں میں سے، کھڑکیوں میں سے، گھونگٹوں میں سے، آنچلوں میں سے مجھ پر تیر برسائے جاتے ہیں اور میں جواب نہیں دے سکتا۔ بارہا حملہ آوروں کے نرغے میں پھنس گیا ہوں، مگر نظر اُٹھا کے دیکھتا ہوں، مدافعہ کی غرض سے نہیں، کیونکہ اس کی طاقت نہیں، بلکہ استرحام، التجا کی نیّت سے۔ تو حملہ آوروں کا پتہ نہیں، چشم زدن میں غائب۔ غُرفہ بند، گھونگٹ کھنچا ہُوا، نقاب پڑی ہوئی ہے۔ گویا کبھی حملہ ہوا ہی نہ تھا۔ یہ انصاف ہے؟ مانا کہ اَلحَربُ خُدْعَةٌ لیکن بہادر للکار کے: خبردار کر کے حملہ کرتے ہیں۔

پھر مشرق جیسا وسیع ملک، اور ہر جگہ مجھے پھانسنے کے لئے

جال پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک دن میں خیال میں مستغرق، دُنیا و مافیہا سے بیخبر، اپنی طرف سے اور کل عالم سے مطمئن اور شاد جا رہا تھا کہ یکایک ایک اندھیرے گھُپ میں داخل ہو گیا، اس اندھیرے گھُپ میں جال، اور وہ بھی کالا، پھیلا ہوا ہے، اور جتنی نکلنے کی کوشش کرتا ہوں اُتنا ہی اور پھنستا جاتا ہوں، جتنا تڑپ کے باہر آنا چاہتا ہوں، اتنے ہی جال کے بند مجھے گھیرے لیتے ہیں۔ یا اللہ! میں کس بلا میں پھنس گیا جب میں تھک گیا تو رضا بقضا، میں نے تحصیل لاحاصل کی کوشش چھوڑ دی۔ اندھیرا زیادہ تھا۔ پہلے تو مجھے دکھائی نہ دیتا تھا۔ جب نظر اس اندھیرے کی عادی ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ ایک میں ہی اکیلا یہاں نہیں ہوں۔ بلکہ اس جال میں اور بہت سے دل پھنسے ہوئے ہیں۔ اس سے کچھ خاطر جمع ہوئی اور خیال کیا کہ ان لوگوں سے مل کے کوئی تدبیر نکلنے کی کرینگے۔ اس لئے میں نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا: "بھائیو! جس مصیبت میں مَیں مبتلا ہوں اس میں تم مجھ سے پہلے پھنسے ہو۔ بہر حال اس سے خلاصی پانے کی کوشش کرنی چاہیئے شاعر نے

دو دل یک شود بشکند کوہ را
پراگندگی آرد انبوہ را

کہا ہے، اور ہم تو دو دل نہیں، اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو سیکڑوں دل ہیں۔ اور یہ پہاڑ نہیں نہایت باریک جال ہے۔ یا اللہ کہہ کے سب ایک ساتھ جست کریں تو کیا عجب کہ اس جال کو توڑ دیں اور رہائی پائیں۔"

عشق اسیری میں نے یہیں دیکھا۔ میری اس معقول تجویز کو سُننا اور اُس پر عمل کرنا کیسا، سب نے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں "تم سے کس نے کہا تھا کہ تم یہاں آؤ اور آئے تھے تو ناصح بن کر تو نہ آئے ہوتے۔ اس دھوکے میں ہم نہ آئیں گے۔ بڑے آئے باتیں بنانے والے۔ ہم بھی قائل ہیں، کیا ترکیب سوچی ہے ہمیں باہر نکال کے خود اکیلے یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! مگر

برو ایں دام بر مُرغِ دِگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ"

مجھے نہایت غصّہ آیا۔ مگر چُپ ہو رہا۔ اکیلا تھا کیا کرتا۔

لیکن تعجّب کی بات سُنئے۔ کچھ عرصہ یہاں رہنا تھا کہ اپن جانب بھی اس اسارت سے محبّت کرنے لگے۔ جتنے جال کے بند کھنچتے جائیں اتنے ہی ہم خوش ہوتے جائیں۔ خُدا سے دعا مانگیں کہ الٰہی یہ بند کبھی ڈھیلے نہ ہوں، بلکہ اور تنگ ہوں۔ تاہم کبھی کبھی اپنی حالت پر افسوس بھی آتا تھا، اور چھٹکارا پانے کی خواہش ہوتی تھی۔

ایک دن عزم بالجزم کر کے، اور نہایت زور سے پھڑ پھڑا کے میں وہاں سے نکل آیا۔ باہر آیا تو معلوم ہوا کہ میں ظلماتِ گیسو میں پھنس گیا تھا۔ اس رہائی پر خدا کا شُکر کر رہا تھا۔ اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آیا تھا، مگر یہاں قدم قدم پر میرا پاؤں پھسلا جاتا، (زمین نہایت چکنی تھی) کہ یکایک اڑا اڑا دھم۔

ایک کنوئیں میں تھا۔ یہاں بھی ظُلمات کی طرح اور بہت سے دل تھے۔ اب چونکہ مجھے ان حضرات کا تجربہ ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے کی طرح اُن کو سمجھانے کی غلطی نہیں کی بلکہ اُن سے معذرت چاہی اور کہا "میں مخل ہُوا، مگر میں عمداً نہیں آیا امید ہے کہ معاف فرمایا جاؤنگا" نیز یہ کہ "میں یہاں سے نکلنے کی جتنی

جلد ممکن ہو گا کوشش کروں گا، یہاں اس قدر روشنی تھی کہ میری آنکھ خیرہ ہوئی جاتی تھی۔ اور اس پر ستم یہ کہ کنوئیں کے اوپر برابر بجلی چمکتی تھی، لیکن بجلی کی چمک کے ساتھ گرج نہ تھی بلکہ نہایت لطیف، لوچدار، نغمہ ساں آواز جسے ہنسی کہہ سکتے ہیں، آتی تھی۔

یہاں سے معلوم نہیں میں نے کس طرح نجات پائی، میں تو سمجھتا ہوں محض تائید غیبی تھی۔ نکلا تو معلوم ہوا کہ میں خوش قسمتوں میں سے ہوں، ورنہ چاہ ذقن میں (قارئین سمجھ ہی گئے ہونگے کہ میں رُخساروں پر سے پھسل کے چاہ ذقن میں گر پڑا تھا) گر کے نکلنا دشوار ہے۔ برق تبسّم اور نغمۂ خندہ، پاگل کر دیتے ہیں۔

مشرق میں میں نے اس قدر ٹھوکریں کھائی تھیں کہ میں یہاں سے بھاگا۔ مغرب میں گیا۔ سوچا یہاں آرام و سکون نصیب ہوگا مگر آرام و سکون کیسا! یہاں بھی وہی بدنظمی، وہی لوٹ۔

بدنظمی سہی۔ لوٹ سہی پھر بھی مشرق کے برابر نہ مجھے مغرب سے شکایت نہیں، یہاں لوٹ ہے، قزّاقی ہے، ٹھگی نہیں یہاں لٹیرے ڈنکے کی چوٹ ڈاکا ڈالتے ہیں۔

یہاں بھی میں جہاں جاتا تیروں کی بوچھاڑ مجھ پر ہوتی تھی لیکن مجھے خبر بھی دیدی جاتی تھی کہ "ہم تیر برساتے ہیں بچ سکتے تو بچو، بھاگو یا سینہ سپر ہو" یہاں تیرانداز، تیر چھوڑ کے غائب نہیں ہو جاتے تھے، بلکہ اگر میں پوچھتا کہ کس نے تیر مارا؟ تو جواب کڑک کے ملتا:- "ہم نے"

"کیوں"؟

"ہمارا کام یہی ہے۔ ہم اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور ابھی تو مشق تیراندازی ہے"

"ابھی صرف مشق ہی ہو رہی ہے"

"بیشک ابھی صرف مشق ہی ہو رہی ہے۔ جب قادر انداز ہو جاتے ہیں تو وہ تیر مارتے ہیں کہ کسی کو اتنی قوت نہیں رہتی کہ ہم سے سوال کر سکے۔ اور ہم کبھی آڑ کے پیچھے ہو کر تیر نہیں مارتے یہ بزدلی ہے اور ہمارے اُصول جنگ کے خلاف ہے۔ زیادہ سے زیادہ آڑ اگر ہم کبھی کرتے ہیں تو صرف دستی پنکھے کی کرتے ہیں، اور بس، اور یہ بھی لڑائی کے شان بڑھانے کے لئے ورنہ کوئی

ضرورت نہیں۔"

"تو آپ اس بات سے شرماتے نہیں کہ آپ تیر انداز ہیں، قزّاق ہیں؟"

"پھر وہی کج بحثی، کہہ تو دیا کہ ہمارا کام یہی ہے، قدرت نے ہم کو اسی لئے پیدا کیا ہے۔ کیا آفتاب کا کام ضیا پاشی نہیں ہے؟ اب اگر چمگاڈر کہے کہ تو نہ نکل۔ میں تاب نہیں لا سکتی، شبنم کہے کہ شرر فشاں نہ ہو میں فنا ہو جاؤں گی، تو وہ مظہرِ شانِ کبریائی منبعِ نور و روشنائی یعنی عظمت و جلالت والا، شوکت و حشمت والا آفتاب اُن کی نہیں سُنے گا یہی نہیں بلکہ نہ سُننے پر مجبور رہے، قانونِ قدرت کا تابع ہے"، "مگر گستاخی معاف، وہ بھی آپ کے ہی ہمجنس ہیں جو مشرق میں چُھپ چُھپ کر، ڈر ڈر کے، اِدھر اُدھر دیکھ کے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو تیر مارتے ہیں۔ یہ کیوں؟

"دیکھا! تیر مارنے سے وہ بھی نہیں چُوکتے، اب وہ اپنی اس خصلت سے نادم کیوں نظر آتے ہیں، یہ ہم نہیں جانتے، وہ جانیں اور اُن کے تیر کھانے والے جانیں۔"

مگر مغرب میں سب سے زیادہ ظالم (فریاد، فریاد اُن کے ستموں سے) وہ تھے جو تیر مارتے تھے، برچھیاں گھونپتے تھے، لیکن جب میں شکایت کرتا تھا تو صاف مکر جاتے تھے "ہم نے نہیں مارا" پہلے تو میں اسے بناوٹ سمجھا۔ ملتجی نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور عرض کیا: "میں آپ کو جھوٹا نہیں بنانا چاہتا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ آپ نے تیر مارا۔"

میری ملتجی آنکھوں کا اُن آنکھوں سے ملنا تھا کہ سیکڑوں ہزاروں تیروں کی پے در پے بوچھاڑ پڑنے لگی۔ مگر اُن کو اس وقت عین اس بوچھاڑ کے وقت بھی اپنے بے تقصیری پر اصرار تھا۔ یہ ہم پر بہتان ہے، تیر و بر کیسا؟ (اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے) "ہم کچھ نہیں جانتے۔" اور ہزاروں تیر برسا دیئے۔

"تم اس قدر زخمی کیوں نظر آتے ہو۔ کس نے گھائل کیا؟" اور ایک نظر، ایک ترحم انگیز اور ہوش رُبا نظر، ڈالی اور ایک لاکھ برچھوں سے مجھے چھلنی کر دیا۔

"ہے ہے، اس قدر نہ تڑپو، کس بے رحم نے تمہیں خون میں

شرابور کر دیا" مگر تجربہ کی کڑیاں سے اور کچھ کے لگا دیئے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت میں اُنہیں اپنے ظلموں کی خبر نہیں۔ تیروں کی بوچھاڑ عمداً نہیں کی جاتی، بلکہ اپنے آپ ہوتی رہتی ہے۔ اُف! اُف! خدا ان تیر اندازوں سے پالا نہ ڈالے۔ کھلے بند قزاق، زخم لگا کے بھاگ جانے والے قزاق یا ٹھگ، ان سب سے میں سینہ سپر ہو سکتا ہوں اور ہوا ہوں۔ لیکن اس تیسری صنف سے تابِ مقاومت نہیں۔ نہیں، بالکل نہیں۔

مغرب کیا، ساری دُنیا میں مَیں قدیم اہلِ یونان سے بہت خوش ہوں، انہیں تعقّل (اور خدا اس لفظ کو دُنیا سے اُٹھا دے) حکمت پر بہت توجہ تھی۔ لیکن میری غذا (حُسن) پر وہ اُس سے زیادہ متوجہ تھے۔

"وینیس" وہیں نکلی، اور وہ اندھا، مگر نٹ کھٹ، شریر لڑکا "کیوپڈ" جو ایک ہاتھ میں تیر اور دوسرے ہاتھ میں کمان لئے اور کندھوں میں پر لگائے اُڑتا پھرتا۔ وہیں پیدا ہُوا۔ وہ مجھے زخمی کرتا تھا لیکن میں بہت خوش ہوتا تھا۔ کیونکہ میرے مدِ مقابل قزاقوں کو

بھی وہ نہیں چھوڑتا تھا اور ....

جہنّم میں جائیں آپ، اور بھاڑ میں جائے میری سوانح عمری وہ سامنے سے اک بدیعۂ خلقت، ایک آلہۂ حُسن و جاذبیّت، ایک مجسمۂ شعر و نزاکت، سمند ناز پر سوار، مجھے شکار کرنے کے لئے آرہی ہے اور اب نہ مجھ میں اتنی طاقت، اور نہ اُس کی خواہش ہے کہ میں اپنے حالات بیان کروں۔ آ، آ کہ مَیں تیری پرستش کروں۔

نوٹ:۔ از پرائیویٹ سکرٹری حضرتِ دل:۔ حضرتِ دل بھلے چنگے تھے۔ اور اپنے حالات لکھا رہے تھے، کہ یکایک ازخود رفتہ ہو گئے۔ اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ افسوس ہے کہ سوانح عمری ناتمام رہ گئی۔ تمام قارئین سے استدعا ہے کہ اُن کی صحت کے لئے دعا کریں۔

چڑیا چڑے کی کہانی

(چڑے کی زبانی)

"چوں چوں چوں چوں، چڑ چوں، سب غلط، سب جھوٹ! چڑیا چڑے کی کہانی بہت انسانوں نے لکھی ہے، مگر قلم در کف دشمن است چوں، چوں چوں، چوں، میری اور چڑیا کی لڑائی بہتان! چڑیا کا آنکھیں دُکھنے کا بہانہ کرنا افترا، چوں چڑ چوں، چوں چوں۔ آؤ اب میں تمہیں چند باتیں سناؤں کہ تمہاری آنکھیں کھلیں۔

حضرت انسان کو باتیں بنانی بہت آتی ہیں اور بس۔ مجھ کو خدا نے مشاہدہ کی قوت عطا کی ہے۔ ویسے دیکھو تو میں بیوقوف، بھولا بھالا اِدھر اُدھر پھُدکتا نظر آتا ہوں، مگر میں دیکھتا سب کچھ ہوں،

سمجھتا سب کچھ ہوں، کہتا بھی سب کچھ ہوں مگر تم نہیں سمجھتے۔

میں دیکھتا ہوں کہ خدا نے مجھے آزاد۔ آزادی طلب اور آزادی پسند مخلوق بنایا ہے، پرندوں۔ اور چرندوں میں بہت سے ایسے ہیں کہ انسان سے بالکل نفرت کرتے ہیں اور جنگلوں میں انسان کے گھونسلوں سے دُور جا کے رہتے ہیں۔ بعض بیوقوف ایسے ہیں کہ انسانوں میں انسان کے خادم ہو کے رہتے ہیں۔ مگر میں انسان کی کارستانیوں کو دیکھنے کے لئے شہر میں رہتا ہوں اُن کے بڑے بڑے بھونڈے بھونڈے گھونسلوں میں اپنا پیارا' پیارا، چھوٹا، چھوٹا گھونسلا بناتا ہوں۔ لیکن وہ پکڑ کے مجھے رکھنا چاہیں تو کبھی نہیں رہتا۔ پنجرے میں بند کر کے رکھنے کی بات دوسری ہے، یا میرے پر کاٹ دیں تو وہ اور ہی بات ہے ورنہ میں کبھی حضرت انسان سے مانوس نہیں ہوتا۔ میں اُنہیں خود غرض سمجھتا ہُوں اور پرلے سرے کا ظالم۔

مگر مجھے اپنی کہانی سُنانی ہے، ضمناً حضرتِ انسان سے بھی دو دو باتیں ہو جائیں گی (پھدک کے اور پروں کو پھلا کے)

خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا اچھا لباس دیا، ایک حد تک خوبصورت مگر نہ اتنا کہ انسان کی حریص نگاہوں کا ہدف بن جاؤں، جسم میں پھرتی دی کہ خوشی خوشی پھدکتا پھروں۔ چھوٹے پروں میں پرواز کی تیز طاقت دی کہ انسانوں کی رفیق اُن کی ہمخصال، اُن کی چہیتی بلّی کی دستبرد سے بچوں۔ جسم ایسا موزوں دیا کہ بیان نہیں ہو سکتا نہ اتنا بڑا کہ شاہین اور باز مجھ پر جھپٹیں جیسے وہ کبوتر پر جھپٹتے ہیں نہ اتنا چھوٹا کہ حشرات الارض کی طرح بالکل حقیر ہی ہو جاؤں اور کوئی مجھے دیکھے ہی نہیں۔

آواز کیسی اچھی، چوں، چوں، چڑ چوں، چڑ چوں آپ کے نزدیک اگر یہ خوش آیند نہ ہو تو نہ سہی، اور میں خوش ہوں کہ آپ اسے پسند نہیں کرتے۔ لیکن میرے ننھے دل کی خوشی اور طمانیت ظاہر کرنے کے لئے یہ بہت کافی ہے۔ چوں، چوں چڑ چوں۔ شکر ہے خدا کا کہ اُس نے بلبل کا ترانۂ شیریں اور نالۂ رنگین مجھے نہیں دیا، ورنہ صیّاد اور قفس بھی میرے

رفیق ہوتے۔ بیوقوف بُلبل کو دیکھئے قفس میں بیٹھ کے بھی گاتی ہے اور اپنی اسارت پر دردانگیز نہیں دل آویز نالے کرتی ہے۔ اور نہیں سمجھتی کہ یہ اُس کی اسیری کو اور بڑھاتے ہیں ؎

گُل و گلچیں کا گلہ بُلبُلِ خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

اگر ذرا بھی عقل ہوتی تو قفس میں پہنچتے ہی خاموش ہو جاتی۔ اور اُس وقت تک خاموش رہتی کہ یا قفس کھُلتا یا موت آتی۔

میں اُڑتا ہوں، پھُدکتا ہوں، دانے چُگتا ہوں۔ مگر الحمدللہ کسی کو آزار نہیں دیتا۔ خدا کی زمین سب کے لئے اور اُس کے دانے سب کے لئے ہیں۔ یہ فلسفہ قدرت نے مجھے سمجھا دیا ہے۔ اور اس لئے میں سب سے کہتا ہوں آؤ اور کھاؤ اور خدا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاؤ جہاں بہت سے دانے ہوئے اور ہم اپنے تمام ہمجنسوں کے ساتھ پہنچے پھر وہاں اگر اور مخلوق

چگ رہی تو میں معترض نہیں ہوتا، کبوتر ہوں۔ مینائیں ہوں، فاختائیں ہوں، سب کو صلائے عام ہے۔ سب ساتھ آئیں اور کھائیں یں اکل کھرا نہیں۔ تنہا خوری میری عادت نہیں۔

حضرت انسان کی بعض باتوں پر مجھے بیساختہ ہنسی آتی ہے: قہ، قہ قہ، چوں، چوں، چڑ چوں، چڑ چوں چوں کس قدر مغرور مگر سادہ لوح جنس ہے۔ میرا نام کنجشکِ خانگی رکھا ہے، یعنی جب انسان کے یہ گھونسلے جن میں وہ آج کل رہتے ہیں نہ تھے اور وہ بہائم کی طرح غاروں اور کھوؤں میں رہتے تھے تو میں نہ تھا؟ میرا گھونسلا نہ تھا؟ یا کیا اب میں سوائے اُن کے گھونسلوں کے کسی اور جگہ اپنا گھونسلا نہیں بناتا؟ اب بھی چمن، صحرا، مرغزار، وادی، درخت، جھاڑی۔ میرے گھونسلے کے لئے ویسے ہی موجود ہیں۔ جیسے انسان کے گھونسلے۔

میں تو ان کے بھنگم موٹے گھونسلوں میں اپنا گھونسلا صرف اس لئے بناتا ہوں کہ یہاں رہ کر اس ریاکار مخلوق کی کرتوتوں کو اچھی طرح مشاہدہ کروں اور پھر اپنے ہمجنسوں میں بیٹھ کر ان خود بینوں، ان بیوقوف، مغروروں کے اوپر ہنسوں۔ اگر میں

انہیں انسانِ خانگی کہوں تو زیادہ زیبا ہے۔

پھر اُن کے گھونسلوں کا حال سُنئے۔ ایک بڑا ہے ایک چھوٹا ہے، ایک اُونچا ہے، ایک نیچا ہے۔ یہ کیوں؟ مساوات کیوں نہیں؟ اسے تو میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے گھونسلوں کے اندر کے خس و خاشاک، جنہیں انسان کیا کہتے ہیں بھول گیا، ہاں، میز کُرسی فرش و فروش مختلف رنگ کے ہوں۔ کیوں کہ میں بھی کہیں سے تاگا کہیں سے تنکا، کہیں سے پتّا لا کر گھونسلا بناتا ہوں، لیکن بڑائی چھوٹائی کیوں ہے؟ ہاں، ہاں خیال نہیں رہا تھا، اس کی وجہ معلوم ہوئی میں نے دیکھا ہے: چھوٹے گھونسلے والا انسان بڑے گھونسلے والے انسان کے سامنے سر جھکا کے، ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوتا ہے، اس کی خدمت کرتا ہے۔ لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ کس قدر بے غیرت مخلوق ہے میں نہ اپنے ہمجنس کی اور نہ کسی غیر جنس کی خدمت کرتا ہوں، اگر مار بھی ڈالو تو خدمت نہ کروں، اور کیوں کروں، خدا کے فضل سے ہم سب مساوی ہیں، کسی کو ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی ضرورت ہے نہ آرزو۔ اپنے بال بچّوں کی خدمت کے سوا،

کسی کی خدمت کرنا، کسی کے گھونسلے پر جا کر دریوزہ گری کرنا عار کی بات ہے، ننگ کی بات ہے، مگر انسان — وہ مدعیٔ عقل، احمق، جو اپنے تئیں درس آموزِ قدرت خیال کرتا ہے، اس نکتے کو نہیں سمجھتا۔

ہائے ریاکار انسان! اس نے ایک لفظ نکالا ہے اور اُس پر اسے بہت ناز ہے۔ کہتا ہے: "سوائے میرے کسی میں حیا نہیں سب جاندار سوائے انسان کے بے حیا ہیں، حیا اور شرم کا احساس صرف مجھ میں ہے۔" او ڈینگ مارنے والی مخلوق! بس، بس۔ جسے تو حیا کہتا ہے وہ ریاکاری ہے۔

انسان چڑا، اور انسان چڑیا، کبوتر چڑا اور کبوتر چڑیا دانہ بدلی کرنے اور پوٹا بھرانے میں ایک ہیں۔ میں نہیں جانتا انسان نے یہ عادت کبوتر سے لی ہے، یا کبوتر نے انسان کی نقل اُتاری ہے۔ اس کی تحقیق نہیں کر سکتا، کیونکہ کبوتر اگرچہ پرندہ ہے، لیکن ایسا احمق، قدرِ حریت ناشناس پرندہ ہے کہ انسان سے بہت مانوس ہے، اور ایسا کاہل ہے کہ اپنے لئے گھونسلا بھی نہیں بناتا، انسان

اُس کے لئے گھونسلا بناتا ہے، اور یہ اُس کے عوض میں اُس کا درم ناخریدہ غلام بن جاتا ہے وہ اُسے پکڑتا ہے، مگر پنجرے میں بند نہیں کرتا، پھر بھی یہ اُس سے نفرت نہیں کرتا، اور اُڑ نہیں جاتا۔

لیکن کبوتر، گو اُسے رات دن غٹرغوں کی ضربیں لگانے اور دانہ بدلی کرنے کے سوائے کوئی اور کام نہیں (صبح سے شام تک یہ حضرت دانہ بدلی کیا کرتے ہیں اور یہ خیال رہے کہ دانہ بدلی بچّوں کا پوٹہ بھرنے کے لئے نہیں، اگر ایسا ہوتا تو کوئی تعجّب کی بات نہ تھی، کیوں کہ بیچارے بچّے اُڑ نہیں سکتے اور اُن کا پوٹہ ماں باپوں ہی کو بھرانا پڑتا ہے، مگر کبوتر یوں ہی بے فائدہ ایک دوسرے سے چونچ ملایا اور پھڑپھڑایا کرتے ہیں، اور ایک منٹ دو منٹ نہیں گھنٹوں یوں ہی کیا کرتے ہیں) گو کبوتر کو اس کے سوا کوئی اور کام نہیں، تاہم۔ سادہ لوح اور صاف دروں مخلوق! —— وہ کبھی انسان کی طرح چھپ چھپ کے دانہ بدلی نہیں کرتا۔

مگر حضرت انسان! ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے، دانہ بدلی میں یہ کبوتر سے کم نہیں، بلکہ بڑھے ہوئے ہی ہونگے، مگر وہی خود

ایجا و حیا اور شرم کی پابندی سے اپنے گھونسلوں میں چھپ چھپ کے، لیکن پہلے کہہ چکا ہوں کہ وہ حیا شرم نہیں ہے، بلکہ وہ ریاکاری ہے جو گھونسلوں میں وہ چوری چھپے کرتے ہیں جسے وہ علانیہ نہیں کر سکتے!

کل ہی کی تو بات ہے؟ یہ تمہارے پڑوس کے گھونسلے میں کئی انسان چڑیا اور چڑے بیٹھے تھے، میں اوپر چھت میں تھا، وہ اپنی زبان میں چوں چوں کر رہے تھے، میں اپنی زبان میں چوں چوں کر رہا تھا، آہستہ آہستہ اس گھونسلے کے ایک حصے میں سے جسے تم کمرہ کہتے ہو اور سب انسان تو چلے گئے اور بس ایک انسان چڑا، اور ایک انسان چڑیا۔ یا تمہاری زبان میں میاں بی بی رہ گئے۔ اب انہوں نے دانہ بدلی شروع کر دی اور پھر وہی پیار محبت کی باتیں ہونے لگیں، تم کہو گے کہ اس میں ریاکاری کی کونسی بات ہوئی؟ سُنیئے: جب اُن کے ہمجنس بیٹھے تھے، اُس وقت انہوں نے یہ باتیں کیوں روا نہ رکھیں؟ اگر کہو شرم کی وجہ سے، بہت خوب! تو بعد میں بھی تو میں کمرے میں موجود

تھا، پہلے مجھے خیال ہوا تھا کہ شاید اُنہوں نے مجھے دیکھا نہیں، اِس لئے میں اُڑ کے اور پھڑ پھڑ کر کے، اُن کے قریب میز پر جا بیٹھا، کرسی پر جا بیٹھا، وہاں سے اُڑ کے دیوار میں جو تصویر لگی ہوئی تھی، اُس کے چوکھٹے پر جا بیٹھا، تب بھی اُن پر کچھ اثر نہیں، اپنے کام سے کام آخر میں نے زور سے چلّانا شروع کیا: "میں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں، چُوں، چُوں، چُوں" مگر بے حیائی دیکھئے، مجھے دیکھ کے دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا، مجھے نہایت غصّہ آیا، اور میں اُن کو گالیاں دیتا ہُوا، پھُر سے کمرے سے باہر اُڑ گیا۔ فرمائیے! آپ ہی فرمایئے، آپ اسے کیا کہتے ہیں حیا یا ریاکاری؟

اسی ایک بات پر کیا منحصر ہے، حضرت انسان کے ڈھنگوں سے میں خوب واقف ہوں کوئی مجھ سے پوچھے۔ کوئی لاکھ بار تو میں نے انسان چڑے کو انسان چڑیا کے سامنے ادعائے وفاداری کرتے سُنا ہوگا:۔

"آہ! میں تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے سوا حور بھی ہو تو اُس پر آنکھ نہ ڈالوں" بیچاری بھولی بھالی چڑیا اسے یقین کرتی

ہے اور محبّت کی آنکھوں سے ـــــ اُن آنکھوں سے جن سے آنسو اور احسان مندی ٹپکتی ہوتی ہیں۔ اُسے دیکھتی ہے یہ ایسا منظر تھا کہ شروع شروع، میں اُس سے بہت متاثر ہوتا تھا لیکن میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی انسان چڑا۔ دوسرے دن دوسرے گھونسلے میں دوسری چڑیا سے۔ پہلی چڑیا کی نظروں سے دُور۔ کہہ رہا ہے: "آہ! میں تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے سوا حُور بھی ہو تو اُس پر آنکھ نہ ڈالوں" اور یہ بیچاری معصوم چڑیا بھی، اس دھوکے باز چڑے کے پھندے میں پھنس جاتی ہے اور اپنا محبّت بھرا دل اُس کے سپردِ کر دیتی ہے۔

تیسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ وہی چڑا ایک اور گھونسلے میں ایک تیسری چڑیا سے کہہ رہا ہے "آہ! میں تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے سوا حُور بھی ہو تو اُس پر آنکھ نہ ڈالوں" اور یہ تیسری تشنۂ محبّت بھی، ان باتوں پر یقین کر کے، دل ہار بیٹھتی ہے۔ آخر کار، ایک دن آتا ہے کہ تینوں کو حقیقت معلوم ہوتی ہے، اور ـــــ یا کنوؤں سے چند جان باختہ انسان چڑیوں کی لاشیں

نکلتی ہیں، یا افیم انہیں ابدی نیند سلا دیتی ہے!

دل چاہتا ہے اس ناپاک مخلوق کو ٹھونگیں مار مار کے مار ڈالوں۔ یہاں چڑیا بول اُٹھی :" چڑے کا قطع کلام تو ہوتا ہے مگر مجھے یہ کہنا ہے کہ انسان چڑیا کا بھولا پن یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے۔ میرا چڑا۔ میں اُس کے سامنے کہتی ہوں کچھ ڈرتی تھوڑا ہی ہوں۔ رات دن مجھ سے کہا کرتا ہے:۔ "تم بیحد خوبصورت ہو، تمہاری برابر دُنیا میں کوئی خوبصورت نہیں"۔ مگر خوشامد سے میرا دماغ نہیں چل جاتا، میں اس کان سُنتی ہُوں اور اُس کان اُڑا دیتی ہوں کیوں کہ گو اُس کی نظروں میں میں خوبصورت ہوں لیکن حقیقت میں خوبصورت نہیں۔ اسے میں اچھی طرح جانتی ہوں مگر کہیں آدم نے حوّا سے کہہ دیا تھا کہ "تم بہت خوبصورت ہو" بس وہ دن اور آج کا دن، کہ انسان چڑیا کے سامنے سے آئینہ نہیں ہٹتا، آئینہ نہیں تو آرسی ہے، آرسی نہیں تو پانی میں اپنا عکس دیکھا جاتا ہے، اور اپنے عکس کو دیکھ دیکھ کے خود ہی جھُوما کرتی ہے اور مارے غُرور کے زمین پر قدم نہیں رکھتی

یہ نہیں سمجھتی کہ یہ سب چڑے کی خوشامد کی باتیں ہیں اور بس۔ پھر گھر میں بیٹھی، چڑے کو نیک اور اپنا عاشق سمجھا کرتی ہے اور چڑا اُس کی غیبت میں رنگ رلیاں مناتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ "مال عرب پیش عرب" ہی رہے تو اچھا ہے۔ میں اس نکتہ کو سمجھتی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں ہر وقت اپنے چڑے کے ساتھ ہوں، یہاں تک کہ تدارک معیشت میں بھی برابر کی شریک ہوں، میں چڑے کو فخر و تفوق کا موقع ہی نہیں دیتی۔ چڑے نے پھر کہنا شروع کیا "اب مجھے دیکھئے یہ کچھ غرور اور ستائش کے طور پر نہیں کہتا اور نہ اپنی پیاری چڑیا کو سُنانے کے لئے کہتا ہوں، بلکہ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ میں ایک — بس ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں، ایک کعبہ کا طواف کرتا ہوں، ایک دیوی کے گرد پھرتا ہوں، میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اُس کے ساتھ پیمان وفا باندھتا ہوں۔ اور اُس پیمان کو نہیں توڑتا، مگر یہ کہ موت آکے اُسے توڑے۔

میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اس کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ میری کُل حرکتوں کی نگرانی کرے، میں جہاں جاؤں، جس

مجلس میں پہنچوں، میرے ساتھ ہو، لڑائی لڑوں تو میرا دل بڑھائے، چہکوں تو میرا نغمہ سُنے۔ انسانوں کی طرح ہم علیحدہ علیحدہ زندگی بسر نہیں کرتے۔

میں (سچ کہنا چاہیئے) کبھی کبھی اپنے پَر دوسری چڑیا کے لئے بھی پھُلا دیتا ہوں، لیکن یہ محض شوخی اور کلیل ہوتی ہے اس سے کوئی خاص ارادہ مقصود نہیں ہوتا اور میری چڑیا بھی اسے جانتی ہے، اِس لئے وہ نہ ناراض ہوتی ہے اور نہ میری طرف سے اُس کے دل میں شبہ بیٹھتا ہے۔

لو، تم سے باتیں کرتے ہیں، میَں بھُول ہی گیا کہ مجھ پر فرائض پدری ہیں، میں انسان باپوں کی طرح نہیں کہ اکثر اپنے عیش میں اپنے بال بچّوں کا خیال تک نہیں کرتے، بلکہ بعض تو ہمیشہ کے لئے انہیں چھوڑ دیتے ہیں، نان و نفقہ بھی نہیں دیتے۔ میں ایسا بے غیرت نہیں۔ جب ان بچّوں کو دُنیا میں لانے کا میں ہی باعث ہوا ہوں تو جب تک خود نہ اُڑ سکیں میَں خود بھُوکا رہوں گا، لیکن اُن کا پوٹہ بھروں گا۔ بڑی دیر ہو گئی، وہ چونچ کھولے انتظار

میں بیٹھے ہونگے۔ ہاں ذرا مجھے دانے یا روٹی کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر توڑ ڈال دو۔

آہا! تم نے میری خواہش پوری کی۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدا تمہارے اور تمہارے بال بچوں کے پوتوں کو بھی ہمیشہ بھرا رکھے۔

لو اب جاتے ہیں،

پھر ملیں گے اگر خدا لایا"

اور یہ کہتے ہوئے دونوں پھر سے اُڑ گئے ۔

نکاح ثانی

گھڑی، گھرّرر، گھرّرر کرکے بجی، دونوں نے ایک ساتھ نظریں اُٹھائیں۔ نوجوان عورت انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ایک خط پڑھ رہی تھی چھوٹی لڑکی، گُڑیا کو بائیں ہاتھ میں لئے اور دائیں ہاتھ کی اُنگلی اُردو کی پہلی کتاب کی ایک سطر پر رکھے، گُڑیا کو وہ سبق جو خود اُس نے آج پڑھا تھا... پڑھا رہی تھی: "کُتا بھونکتا ہے ... بلّی میاؤں کرتی ہے ...... اونٹ بلبلاتا ہے"...... دونوں کی آنکھیں ایک دم اُٹھیں اور گھڑی پر پڑیں۔ نوجوان عورت نے اپنے دل میں کہا: "لو، نو بج گئے" لڑکی نے

گھڑی پر سے ماں کے چہرے پر نظر ڈالی، اور بات کے لئے بہانہ ڈھونڈھ کے کہنے لگی: "امّاں جان، گھڑی نو دفعہ بجی نا؟"

ماں نے مُنہ سے کچھ نہ کہہ کے، مگر ذرا سر ہلا کے، گویا "ہاں" کہا۔ بچّی نے تھوڑے تردد کے بعد پھر پوچھا: "ابّا جان کا انتظار کب تک کریں گے؟" ماں نے اس کا جواب بھی کچھ نہ دیا۔

ہاں انتظار کریں گے، یوں ہی انتظار کریں گے۔ عورت نے کاغذ کو پھر اُٹھایا۔ آہ! اگر اب بھی آئے، اور نگاہ محبّت سے اُسے دیکھے تو وہ، اس گمنام، بے دستخط کے کاغذ کو پھاڑ ڈالے گی، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گی اور بالکل ضائع کر دینے کے لئے انگیٹھی میں ڈال کے راکھ کر دے گی، اُس پر یقین نہ کرے گی، اپنے شوہر کی بے وفائی کی اطلاع دینے والے کاغذ پر ذرا سا بھی یقین نہ کرے گی۔

"یا اللہ! کیا یہ ممکن ہے؟ تو یوں کہئے، یہ جو ہر دوسرے تیسرے رات رات بھر غائب ہو جایا کرتے ہیں، یہ سب بے وفائی کا نتیجہ ہے یہ سب کسی بیسوا کو دل دینے کا باعث ہے یہ جو کہا جایا کرتا تھا کہ آج کچہری کے فلاں دوست کے ہاں دعوت ہے شاید رات کو نہ آسکوں،

آج کمپنی باغ میں بینڈ سُنتا رہا، اس لئے دیر ہو گئی۔ آج فلاں جگہ جلسہ تھا، اس لئے جلد نہ آسکا، یہ سب عذر جنہیں وہ یقین تو کیا کرتی تھی، مگر دھڑکتے ہوئے دل سے کہ کہیں جھوٹ نہ ہوں، یہ سب عذر جھوٹ ہی تھے، اور صرف یہ کاغذ، یہ ناپاک عبارت جو اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کی ہنسی اُڑاتی معلوم ہوتی ہے، صحیح ہے۔"

یہ کاغذ! وہ تو اس کا تمام ...... اس کا کوٹھا اور تمام تفصیلات تک بتاتا ہے۔ کہتا ہے: "اگر چاہو تحقیق کر لو" یعنی بالکل صحیح ہے؟ انکار کی مجال نہیں، اُس کے جھوٹ ہونے کا احتمال نہیں ؟ یہ خیال اُسے گویا شکنجہ میں دبا دبا کر پیسے ڈالتا ہے۔

اور اُس وقت، ایک منٹ میں گذشتہ واقعات: ماضی کے شیریں پردے کو ہٹا کے ایک دم اُس کے سامنے آکھڑے ہوئے: وہ باتیں، وہ عذر جو اُس نے اپنے شوہر کی زبان سے سُنے تھے اور مان لئے تھے، وہ گراں واقعات جنہیں اُس نے تحمّل کیا تھا اور بھول گئی تھی، وہ لڑائیاں جو نہ معلوم کیوں اُن میں ہوئی تھیں، باوجودیکہ خود اُس نے کبھی اپنے شوہر سے لڑنے کا ارادہ نہیں

کیا تھا، وہ تحقیریں اور چھوٹی چھوٹی اہانتیں جو اس کی کی جاتی تھیں اور جنہیں وہ معاف کر چکی تھی اور بھول چکی تھی، یہ سب پردۂ ماضی سے نکل کر قطار در قطار سامنے آ کھڑی ہوئیں، اور اپنے اصلی رنگ میں (اُس رنگ میں جن میں اُنہیں بھولنا، معاف کر دینا، برداشت کرنا ممکن نہ تھا) اپنے تئیں ظاہر کرنے لگیں۔

اور اس وقت وہ ان کے عذاب سے تنگ آ کر اور اُس کے جگر میں جو اختلاج پیدا ہو رہا تھا، اس سے مغلوب ہو کر اپنے ہاتھوں کو مل رہی ہے، جسم تھرّا رہا ہے۔ اپنی انگلیوں کو اس طرح اینٹھ رہی ہے گویا توڑ ڈالے گی، ہاتھوں کو اس طرح بڑھاتی ہے: گویا اپنے کندھوں سے اُکھاڑ دینا چاہتی ہے۔

چلّانے کے لئے، رونے کے لئے اُس کو بہت بڑی ضرورت محسوس ہوتی تھی، لیکن اس کاغذ پر یقین کرنا نہیں چاہتی تھی، یقین نہ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اب اُس نے اپنی نگاہیں اس کاغذ پر سے اُٹھا کر، دیوار پر ڈالیں، جہاں کچھ اونچے پر سایہ میں شوہر کی تصویر لگی ہوئی تھی، گویا اس چہرے میں، اس اہانت، اس

بے وفائی کے جھوٹ ہونے کی علامتیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اور اس وقت چند منٹ میں اپنی بیاہی زندگی کو پھر دوبارہ بسر کر گئی۔ اس کی بیاہی زندگی کے مرقعے اس طرح گذر گئے جس طرح کسی منبع سے مختلف رنگ کی روشنیاں کسی چیز پر یکے بعد دیگرے پڑیں۔ ان مرقعوں میں وہ چہرہ جو اُس کے مقابل تصویر میں ہنس رہا تھا ہمیشہ ہوتا تھا۔

وہ پہلی رات، وہ اس رات تو اُسے چاہتا تھا، وہ رات جب کہ وہ تمام حیات قلبی کے ساتھ اُس سے کانپ کانپ کر باتیں کر رہا تھا اور وہ مارے شرم کے پریشان و لرزاں تھی اور اُس کے چہرے کو نہ دیکھتی تھی۔ اُس رات بلاشبہ وہ اُسے چاہتا تھا، ہاں صرف اُسے چاہتا تھا!

یہ بیچاری لڑکی، اُس رات، اُسے کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کے اُس کی باتیں سُن سُن کے تہ دل سے یقین کر رہی تھی کہ یہ منوّر و مسعود رات شب عشق ہو کر، لیل وصال بن کر ہمیشہ قائم رہے گی، تاابد ختم نہ ہوگی،

اس کے بعد مرقع کا ایک اور صفحہ پیش نظر ہوا، ایک دن صُبح کا

وقت تھا وہ سوتے سوتے یکایک جاگی۔ کیا دیکھتی ہے کہ وہ خواب سے بیدار ہے، اس کے قریب بیٹھا ہے اور ایک اُلفت پاش مفتونیت سے آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے ہوئے ہے۔ وہ سونے میں اس طرح دیکھے جانے سے لجائی! اور اپنی گھبراہٹ اور شرم کو چھپا نہ سکی کہ اتنے میں اُس نے اُس کے مُنہ کو جو حیرت سے کھل گیا تھا، ایک لمبے بوسے سے بند کر دیا۔ آہ یہ بوسے! لیکن اس وقت تو زندگی بوسوں ہی میں گزرتی تھی۔ اُس زمانے میں تو وہ یہ خیال کرتی تھی کہ زندگی، ایک دائمی بوسۂ عشق ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن ان بوسوں کے درمیان، اُس نے زہر کا ایک گھونٹ چکھا، کوئی سبب نہ تھا، کوئی وجہ بظاہر معلوم نہیں ہوتی تھی، کہ ایک دن اُسے ان عشق کے بوسوں میں چھپی ہوئی ایک کھٹک محسوس ہوئی، جس نے اس کے قلب، اُس کی روح تک جاکر ایک ضرب لگائی۔

بس اس وقت، اُس سیکنڈ سے اُسے ایک مبہم، غیر معنی ڈر نے ستانا شروع کر دیا، لیکن اگر یہ غیر معنی خوف، غیر معنی ہی رہتا، تو وہ ایک پُر لطف خواب کی بے معنی گھبراہٹ پر محمول کر کے، اپنے دل کو دھوکا

دے دے کر خوش رہتی، مگر یہ بھی نہ ہوا۔

ایک دن، اتوار کا دن تھا، وہ گھر سے نکلتے وقت اُس کی طرف نہ دیکھ کے یہ کہتا ہوا کہ "شاید میں آج دیر سے آؤں" جانا چاہتا تھا اس وقت بھی اُس کی نظروں میں وہ وقت اور موقع پھر رہا ہے، جب اُس نے پوچھا: "کیوں؟" اور اُس کی آنکھوں سے آنکھیں ملانا چاہیں تو اُس نے جھوٹ بولنے والوں کی مخصوص پریشانی کے ساتھ، اپنی چھتری کو لپیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا: "آج اتوار کا دن ہے شاید دوستوں کے ساتھ سیر وغیرہ میں دیر ہو جائے" پہلا جھوٹ! اس پہلے جھوٹ پر یقین نہ کرنے کے لئے اُس نے تمام رات کوشش کی تھی، تمام رات اپنی طبیعت کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ یہ عذر جھوٹ نہ تھا، اور اس کوشش میں اسکی واپسی کے وقت تک آنکھ بھی نہیں جھپکائی تھی۔ آخر وہ واپس آیا، اس واپسی کے وقت، وہ اُس کی زبان سے ایک کلمۂ تسلّی، ایک حرف اعتذار سُننے کی اُمید رکھتی تھی۔

"تم اب تک سوئی نہیں؟"

"نہیں، تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

اس جواب پر اگر وہ ایک حرف ہی کہتا، ایک حرفِ محبّت! تو اپنے اضطرابات کو وہ فوراً بھول جاتی، مگر اُس نے کچھ بھی نہ کہا، رات کے کپڑے جلد جلد پہن کے، پلنگ پر لیٹتے وقت اُس نے اُس کا بوسہ لیا تو، مگر اس بوسہ میں ایک اجتناب، ایک رکاوٹ ملی ہوئی تھی پلنگ پر اس طرح گر پڑا گویا تھکن کے مارے اُس کا تمام جسم ٹوٹ گیا اور یہ کہہ کے: "آؤ سو رہیں" فوراً آنکھیں بند کرلیں اور سونے لگا۔

اس رات، رضائی میں مُنہ چھپا کے، کہ کہیں وہ نہ سُن لے، وہ رات بھر چُپکے چُپکے رویا کی، رویا کی،

اس کے بعد، بات بات پر اُس کا دل بھر آیا کرتا تھا، اور اس کا خاوند بھی اُسے روتا دیکھتا تھا، اور اُس کے رونے پر اپنی وحشت اور گھبراہٹ ظاہر کرتا تھا، اتنے اخلاق کا بھی استعمال نہ کرتا تھا کہ اس وحشت کو چھپانے کی کوشش کرتا۔ کبھی بلّی کی طرح جو اپنے جسم کو آکر اپنے مالک سے سہلاتی ہے، لیکن زرا سی تکلیف پر پنجہ مارنے کے لئے تیار رہتی ہے، وہ اس سے کہتا: "دیکھو روؤمت، میری جان پہلے کی طرح مجھے چاہتی ہو نا؟ آنکھیں پونچھ ڈالو، زرا آنکھوں سے

آنکھیں تو ملاؤ، جان ذرا ہنس تو دو" پھر ذرا سی دیر میں بلی کی طرح نرم پنجوں میں سے تیز ناخون نکالتا، یعنی کہتا: "بس بس رونا بہت ہو گیا، اس بسورنے کو بند کرو، گھر کیا ہے امام باڑہ ہے، تم مجھے بالکل گھر سے نکال دو گی" یہ باتیں کب سنتی تھی، جب کوارپن، بالپن کو پیچھے چھوڑے ہوئے صرف چھ ہی مہینے ہوئے تھے، چھ مہینے میں اس بیچاری عورت، جوان عورت کو رونے کے لئے کس قدر کافی وقت مل گیا تھا، نہ صرف یہ، بلکہ شوہر کو اس سے سیر ہونے، اور ان کلمات کے کہنے کا بھی وقت مل گیا تھا۔

ہائے وہ اُمیدیں! وہ کس طرح منقطع ہو گئیں! رہا سہا رشتۂ قلب اُس کے اس آخری فقرے نے "تم مجھے بالکل گھر سے نکال دو گی" توڑ دیا، تو گویا وہ پہلے ہی اپنے تئیں گھر سے نکلا ہوا سمجھتا ہے، کہ یہ رونا "بالکل" گھر سے نکال دیگا! اس کے بعد اُس نے اُس کے سامنے طبیعت کو روکنا شروع کیا، کبھی کبھی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے، لیکن وہ نہایت کوشش کر کے، پلکوں کو دبا کے ان آنسوؤں کو نکلنے نہ دیتی، ایک دن، وہ اُس کے سامنے بھی طبیعت کو نہ روک سکی،

وہ، وہ دن تھا کہ اُس نے اُسے خبر دی تھی کہ وہ اُس سب سے اعلیٰ ہدیہ کو جو عورت اپنے خاوند کو پیش کر سکتی ہے، اُٹھائے ہوئے ہے اور کچھ دنوں میں پیش کرے گی۔ اس خبر کو دیتے وقت، وہ سمجھتی تھی کہ مارے خوشی کے اُچھل پڑے گا، اُس کے گلے سے لپٹ جائیگا مگر وہ پتھر کی مُورت کی طرح وہیں کا وہیں رہ گیا، متحیر آنکھوں سے یوں دیکھنے لگا، گویا سمجھا نہیں۔ پھر کہنے لگا: "مگر بہت جلد"! باپ بننے کی خوش بختی کی خبر پر پہلا کلمہ جو اُس کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا! حالانکہ قلباً اُس کا خاوند بُرا آدمی نہ تھا، اُس کا دل گواہی دیتا تھا کہ وہ بُرا آدمی نہیں ہے، سخت دل نہیں ہے، پھر اس قسم کے فقرے کیوں کہے جاتے ہیں؟ کیوں اُسے رُلایا جاتا ہے، کیا اُن کے درمیان کوئی راز ہے، کوئی غلط فہمی ہے؟

"بہت جلد"! اس طعن پر وہ اپنی طبیعت کو نہ روک سکی، اور رو پڑی، اس خیال سے معذب ہو کر رو پڑی، کہ لو اب تک میں اپنے تئیں اس سے نہ چھُوا سکی۔ لیکن اس رات، وہ اس کے رونے پر غصہ نہ ہوا، بلکہ اپنے فقرے کے اثر کو گھٹانے کی کوشش کرتا رہا۔

"مَیں تو مذاق کرتا تھا، تم اُسے سچ ہی سمجھ گئیں۔ کہیں مذاق سے بھی انسان اس قدر متاثر ہوا کرتا ہے، واہ واہ! علاوہ ازیں میں نے جو کہا، تمہارا ہی خیال کر کے کہا، ذرا سوچو تو، اگر لڑکی پیدا ہوئی، تو دس پندرہ برس کے بعد تم اور وہ دو بہنیں معلوم ہوگی"
اور یہ کہہ کے، اور اُس کی انگلیوں میں اُنگلیاں ڈال کے، اور بالوں کو چُوم چُوم کے، وہ گویا اُس سے معافی مانگتا تھا، اُس نے اُسے معاف کر دیا۔ وہ ہمیشہ ہی معاف کر دیا کرتی تھی۔ ہمیشہ اُن شکر رنجیوں کو جو اُس غیر معنی شئے اس راز اُس غلط فہمی سے پیدا ہوا کرتی تھیں وہ معاف کر دیا کرتی تھی۔

لڑکی پیدا ہوئی، اور اس واقعہ نے ایک بڑی تبدیلی کر دی اُس نے اپنے خاوند کو، زچگی کے پلنگ کے سرہانے روتا ہوا دیکھا یہ اپنی پچھلی حرکات پر ندامت کا رونا تھا، یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُس نے خاوند کو روتے ہوئے دیکھا، یہ آنسو گویا اس بیچاری کے سال بھر کے اضطراب کو دھو رہے تھے، مٹا رہے تھے۔

اس کے بعد اُس کے خیال میں اچھی گزری یا شاید یہ ہو کہ

سال بھر تک جن باتوں کی وہ عادی نہ ہوئی تھی، اب ان کی عادت پڑ گئی تھی، اور اس لئے اب دوستوں کی دعوتیں، سیر میں بہت دیر ہو جانا، اس کی توجہ کو اپنی طرف مائل نہ کرتے تھے، یہاں تک کہ دعوتوں اور تاخیر سیر میں آہستہ آہستہ تواتر پیدا ہونے لگا، پھر بھی اُس کے دل میں کچھ شُبہ پیدا نہ ہوا۔

اُف! آخر کار وہ عظیم واقعہ! جس کا خیال اُس کے آنکھوں کے سامنے، اُس کے غضب ناک چہرے، اور آتش فشاں اور جگر سوز نظروں کی تصویر لا کے کھڑا کر دیتا ہے، اور یہ غضب اور یہ آتش فشانی کس لئے ہوئی تھی؟ محض ایک چھوٹی سی بات پر، مگر لڑائی کے لئے ایک بہانہ تھا، اور اُس وقت وہ پاگلوں کی طرح ہذیان بکنے لگا تھا۔

جوان عورت، اس واقعہ کو یاد کرتے وقت، خیال میں بھی پورا نہیں کرتی، اُس کا غرور نسوانی، اُس واقعہ کا خیال آتے ہی، اُسے پُر قہر کر دیتا ہے اور اس لئے کہ وہ مارے غصّے کے کانپنے نہ لگے وہ اس واقعہ کی یاد کو یوں ہی ادھورا چھوڑ دیتی ہے۔

یہ وہ واقعہ تھا کہ اُس پر اُس نے بھی کُھلم کُھلا اپنے خاوند سے اعلان جنگ کر دیا تھا اور اس کی ناسزا باتوں کا ناسوا باتوں سے جواب دیا تھا، یہ لڑائی برسوں رہی۔

اس زمانے میں ایسے ایسے دن بھی آتے تھے کہ وہ کئی کئی دن تک گھر نہ آتا تھا، ایسی راتیں بھی آئی تھیں، کہ وہ دونوں ایک بستر میں آرام کرتے تھے۔ مگر دو دشمنوں کی صفت سے لیٹے ہوتے تھے: دونوں مُنہ پھُلائے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے سے مُنہ پھیرے ہوئے، دونوں میں بات چیت بند! غرض کہ اس زمانے میں دونوں دشمن تھے، لیکن پھر بھی نوجوان عورت اسے اچھی طرح جانتی تھی، کہ جس زمانے میں وہ اس کی سخت دشمن تھی، اُسی زمانے میں اس کی محبّت دل میں بیٹھی ہوئی تھی، اور اس سے بھی واقف تھی کہ گو وہ اس زمانے میں اس کی تحقیر کرتا تھا، اُسے ستاتا تھا، تاہم وہ اُسے چاہتا تھا، اُس کا اسیر محبّت تھا۔

جب کیفیت یہ تھی، تو یہ زبون زندگی کیوں، کیوں دونوں کسی طرح خوش خوش زندگی بسر نہ کر سکتے تھے؟ کیوں اُن میں

یہ کشمکش، یہ لڑائی رہتی تھی؟ وہ اُس سے نفرت کرنے کی کوشش کرتی اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا، کہ بالعکس وہ اپنے تئیں اُس کی طرف مائل پاتی تھی۔ اگر وہ یہ مان لیتی کہ یہ آدمی بُرا ہے، تو غالباً وہ اس سے نفرت کر سکتی، اگر وہ حقیقتاً بُرے دل کا آدمی تھا، تو ہر لڑائی ہر شکر رنجی کے بعد ندامت کے ساتھ آنا، اور اپنے ہاتھوں میں اس کا مُنہ لے کے چُومنا، اور بغل کو گدگدا کے ہنسانے کی کوشش کرنا، اور ہر طریقے سے صلح کرنے کی ترکیبیں کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔

اس بڑی لڑائی کے بعد جو اتنی مدت تک رہی، لڑکی کے چیچک نکلنے پر بھی یہ ہی ہوا تھا نا؟ بچّی کے بخار اُترنے، اور دانے جھڑنے پر جو گھر میں ایک بڑے اندیشہ سے نجات پانے پر خوشی پھیلی ہوئی تھی، اس خوشی نے شوہر کو آخر کار اپنی بیوی کے آغوش میں گر کر معافی مانگنے پر مجبور نہ کیا تھا؟

اگر وہ اچھّا آدمی نہ ہوتا، تو بھلا یہ ہو سکتا تھا؟ اُس کی یگانہ تسلّی اس کے شوہر کی یہ صفت تھی، چھ برس سے بُرے دنوں کو، لڑائی کے دنوں کو بھلا دینے والی صرف یہ صفت تھی۔ وہ کبھی یہ گمان نہ کرتی

تھی، کہ ان واقعات کے ساتھ، ان واقعات کے باوجود بھی بے وفائی ہو سکتی ہے۔

ہاں اُس نے کبھی اسے سوچا بھی نہ تھا، یا یہ کہنا چاہئے کہ سوچنا چاہا بھی نہ تھا، اُسے بے وفائی سے پاک، معرّا دیکھنے کی آرزو اس قدر شدید تھی کہ بے وفائی کے شُبہ دلانے والی چیزوں کو بھی خاص کوشش کر کے ذہن سے نکال دیا کرتی تھی۔

اب نوجوان عورت غور سے دیکھنے کے لئے آنکھوں کو کھول کے دیوار پر سایہ میں لٹکی ہوئی تصویر کو دیکھتی ہے، اور ایک نا اُمیدی کے لہجے میں کہتی ہے، آہ! یہ اُمید بھی جھوٹی اُمید نکلی۔

اُس کی پریشان آنکھیں تصویر کو دیکھ دیکھ کر اُس پر مواخذہ سوال کو "تو تو بے وفا ہے؟" کہہ رہی تھیں، کاغذ گھُٹنوں پر سے فرش پر گر پڑا تھا۔

بچّی نے اس سے مطمئن ہو کر کہ گڑیا نے خوب اچھی طرح سبق یاد کر لیا، اپنے ننھے بازو پر سر رکھ کے، گویا بڑے فرض سے فارغ ہو کر آرام سے سونا شروع کر دیا، گھڑی پھر ایک بڑی گھبراہٹ کے ساتھ

بجی۔ دس بجے۔

اب بھی نہیں آئیگا؟ مگر اب، ہاں اس دفعہ، وہ نہ آنے کا سبب جانتی تھی۔ راتوں کو جو بیٹھ کے گھڑیوں انتظار کیا کرتی تھی اور دوستوں کی صحبت میں دیر ہو جانے کا خیال کر کے اپنے دل کو دھوکا دیا کرتی تھی، آج کی رات اپنے دل کو اس دھوکا دینے، اس طرح تسلّی دینے کا موقع نہیں۔ اس جھوٹی تسلّی کو بھی، ایک کاغذ کے ٹکڑے نے آکر اس سے چھین لیا۔

سڑک پر سے اک گاڑی کے گزرنے نے گھر کی کھڑکیوں کو ہلا دیا بیچاری عورت نے بڑی اُمید سے جھلملی میں سے سڑک پر نظر ڈالی، شاید اس گاڑی میں وہ ہو مگر کوچوان نے گھوڑوں کو قمچی ماری اور گاڑی تیزی کے ساتھ گزری چلی گئی۔

اُس وقت عورت نا اُمیدی اور عصبی غصّے سے کانپنے لگی۔ کاغذ کو زمین سے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا، اور سوتی بچّی کی کلائی پکڑ کر کہنا شروع کیا: "نہیں آئیں گے، تمہارے ابّا جان اب بھی نہیں آئیں گے"۔ لڑکی نے آنکھ کھول کر حیرت سے ماں کا منہ تکنا شروع

کیا، دیکھا کہ چہرہ اس قدر پریشان ہے، آنکھیں اس قدر جل رہی ہیں کہ وہ ڈر گئی، ادھر کلائی کے دبنے سے، اور اُس کے چھڑانے کی کوشش کرنے سے اُس کے ہونٹ بگڑ گئے، آخر اپنی ماں کی حالت اور کلائی کے دبنے کی تکلیف سے وحشت زدہ ہو کر، اُس نے رونا شروع کر دیا۔ اس وقت، نوجوان عورت بھی اُن آنسوؤں کو جنہیں وہ گھنٹوں سے روکے ہوئے تھی نہ روک سکی، اور بچی کو گود میں لے کر اور اپنے سینے سے بھینچ کر اُس نے بھی سیل اشک جاری کر دیا، اور اس طرح ماں اور بیٹی مل مل کر، ماں سب جانتے ہوئے، بیٹی نہ جانتے ہوئے، اپنے شوہر اور باپ کی غیبوبیت پر رو رہی تھیں۔

یہ پہلی رات نہ تھی، کہ وہ اکیلی تھی۔ لیکن اور راتوں کو، ایک فراغتِ نفس کے ساتھ اس تنہائی کو کاٹ دیتی تھی، کیوں کہ اپنے دل کو اس خیال سے تسلّی دیا کرتی تھی، کہ باوجود چڑچڑے مزاج ہونے کے وہ میرا مفتون، میرا دلبند ہے اور اب بھی آئے گا تو میرا مفتون، میرا عاشق ہو کر واپس آئیگا، لیکن آج وہ تسلّی کہاں، آج اُس تسلّی کو اس کاغذ کے ٹکڑے نے کس بیرحمی کے ساتھ

پاؤں تلے روند دیا! لڑکی کی ہچکی بندھ گئی، تو اُسے ہوش آیا، اور
اُس نے اپنی طبیعت کو یکسو کر کے، لڑکی کو تھپکا تھپک کے سلانا چاہا،
لڑکی سو گئی: اور اُس کے دماغ میں اس کاغذ کے واقعات نے
پھر آکر جمع ہونا شروع کر دیا۔ اب ایک عزمِ متین کے ساتھ وہ ایک
کام کرنا چاہتی تھی، اس خوفناک حقیقت کے کھلنے کے بعد فوق البشر
کوشش سے وہ ایک علاج ڈھونڈھنا چاہتی تھی جو اس قسم کی زندگی
سے جسے بسر کرنا ممکن نہ تھا اُسے رہائی دے اور پھر اس کی پہلی
پُر لطف، پُر محبّت زندگی واپس دے دے۔ اور یہ کام اس
ضعفِ نسوانی کے ذریعے سے کرنا چاہتی تھی جو اب تک ہمیشہ زبون
اب تک ہمیشہ مغلوب ہی رہا تھا۔

اس بات کا اُسے پورا یقین تھا کہ اُس کے دل میں اک مایۂ محبت بچا
ہے۔ وہ اسے بھی جانتی تھی کہ کُل ماضی مع اس خوفناک حقیقت
کے ایک دھبہ ہے جو دُھل سکتا ہے، محو ہو سکتا ہے اور یہ بیچاری
دھوکے کھائی ہوئی عورت چاہتی تھی کہ اس خوفناک واقعہ کو
بھی عفو کر دے، جیسا وہ اور واقعوں کو عفو کر چکی تھی، لیکن اسے

بھول جانے کے لئے یہ ضرور تھا، کہ شوہر تماماً اس کا، صرف
اس کا ہو جائے۔

اس لڑکی کو تھپکاتے وقت کہہ رہی تھی: "آہ! وہ عورت،
تو یوں کہنا چاہئے کہ میرا خاوند مجھ سے زیادہ اُس سے متعلّق ہے"
اس کا حوصلہ اُسے قبول نہ کرتا تھا، وہ گزشتہ چھ برس کی
زندگی، جو باوجود اپنی تمام مصیبتوں کے آج کی رات کے مقابلہ
میں گویا پُر راحت زندگی تھی، اس کل زندگی میں وہ عورت شریک
تھی! اس زندگی کا ایک حصّہ، شاید بہتر حصّہ، یقیناً بہتر حصّہ،
یک بیسوا کے نصیب ہوا۔

وہ پیار جو اُس کے لئے ہونا چاہئے تھا، مگر نہیں ہوا، وہ
بوسے جو اُسے ملنے چاہئے تھے، مگر نہیں ملے، وہ اُس دوسری
کو دیئے گئے! ہاں، ہاں وہ جو ایک دن ان بوسوں میں ان
بوسوں کے درمیان، اُس نے ایک زہر کا گھونٹ چکھا تھا وہ اس
بیسوا کے ناپاک مُنہ کا بچا ہوا ایک قطرہ تھا! یہ خیال کرتے
وقت اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خود بھی ناپاک ہو گئی، اور

خود اپنے سے اُسے نفرت ہونے لگی، اس آدمی نے، اس شوہر نے کیا کیا نہ کیا؟ اُس کے بستر سے نکل کے اِس کے بستر میں آنا، اُن ہونٹوں سے جو اُس کے مُنہ چُومنے سے تر اور ناپاک تھے، اِس کا ایک بوسہ لے کر، گویا ایک بوسہ صدقہ کر کے، اس کا مُنہ ناپاک کرنا، اُس کی رائحۂ حیات سے مست اور مدہوش ہوکر، اس کے پاس آنا، اور اُس کے بالوں میں سر ڈال کے، مشام خیال سے، اُسی کو سونگھنا اُس کے بازو پر سر رکھ کے سوتے وقت، خواب میں اُس کے ساتھ ایک ناتمام رہے ہوئے جلسۂ عاشقانہ کو دیکھنا! آہ! اس آدمی نے اس صاف و پاک نوجوان عورت کو، ایک بیسوا کا شریک بستر کر کے ملوث کر دیا تھا!

یا اللہ! کیوں وہ ایسا کرتا تھا؟ اگر حقیقت میں اُسے چاہتا تھا تو پھر یہ بے توجہی، یہ اغفال کیوں؟ یہ ایک خطائے موقت ایک قضائے غفلت بھی نہ تھی، اسے، اِس طرح برسوں سے دھوکا دے رہا ہے، برسوں سے یہ بے وفائی، یہ خیانت کر رہا ہے اور یہ بچی؟ اس بیسوا کے عشق پر صرف وہی نہیں، بلکہ یہ چھوٹا ننھا

فرشتہ بھی قربان کیا جا رہا ہے۔

یہ بچی بھی روز اپنے ابا کے آنے کا انتظار کرتی ہے، اور نہ آنے کا سبب نہیں جانتی، وہ پیار جو اس معصوم کا حصّہ تھا وہ اُسے نہیں ملتا، اک معصوم کا حق بھی غضب ہو رہا ہے۔ اس غضب پر کیوں اس نے کمر باندہ رکھی ہے۔

نہیں، نہیں، یہ حالت نہ رہنا چاہیئے، نہ رہنے دی جائیگی نہ رہے گی، ایک علاج، ایک تدبیر، جو ان تمام باتوں کو مٹا دے، ان تمام باتوں کو ایک بُری خواب کی یاد کی طرح چھوڑ جائے، آہ! کوئی تدبیر سوجھے، کوئی ایسی تدبیر کہ کارگر ہو۔

اس کے بعد پھر اُس کے بدن سے، یاس اور عجز کی وجہ سے طوفانِ اختلاج اُٹھا، اور سیل اشک بہانے لگا، اب اُسے اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اپنی لڑکی پر نظر ڈالے، رومال میں مُنہ چُھپا کے آہستہ آہستہ رونے لگی۔

دوسرے دن صبح اُٹھی اور تدبیر کو سوچے ہوئے اُٹھی اور اس تدبیر کو عمل میں لانے کا پورا ارادہ کئے ہوئے اُٹھی، گو

آج تک کسی باعصمت عورت نے یہ نہیں کیا مگر وہ کرے گی، اس خارق العادت کام کو کرے گی یعنی جاکر اس بیسوا کی منّت کریگی اور اُس کا خاوند اُسے واپس دے دینے کی التجا کرے گی۔ اس کاغذ میں پتہ مفصّل تحریر تھا، "چوک کی بڑی سڑک میں داہنے طرف حلوائی کی دوکان کی بازو سے جو گلی پھٹتی ہے، اُس میں چوتھا مکان پیتل کے پتروں والے کواڑ کا دروازہ ..." اس بڑی مصیبت میں اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے والی ماما تحقیق کر آئی تھی +

(۲)

وہ آج کی صبح ابھی پوری بیدار بھی نہ ہوئی تھی، آنکھوں میں رات بھر دیر تک جاگنے سے مخموری چھائی ہوئی تھی وہ خلقت جو اس زمرہ کے متوسّلین میں سے ہے، اپنے اپنے گھر چلی گئی تھی، یا زیادہ صحیح یہ کہ ابھی گھر سے واپس نہیں آئی تھی، اس کی گرگ باراں دیدہ ماں بھی کسی کام سے باہر تھی، صرف ایک خدمت گارنی گھر میں موجود تھی۔

خدمت گارنی نے اوپر جاکر سونے کے کمرے کا کواڑ آدھا

کھول کے کہا: "ایک بی بی بُرقع اوڑھے آئی ہیں، اور آپ سے ملنے کے لئے اصرار کر رہی ہیں"۔ اس خبر پر اُسے بہت حیرت ہوئی۔ اُس نے آہستہ سے (کہ کہیں وہ جو پہلو میں سو رہا تھا جاگ نہ اُٹھے) کہا: "بُرقع والی بی بی! مجھ سے ملنا چاہتی ہے؟"

اُسے یقین نہ آتا تھا، بُرقع والیاں بھی اُس سے ملنے آنے لگیں! اب تک کوئی بُرقع والی اُس کے ہاں آئی نہ تھی۔ پریشان بالوں کو جلد جلد سنوارتے ہوئے، آنکھوں کو ملتے ہوئے رومال سے مُنہ پونچھتے ہوئے۔ کیونکہ مُنہ دھونے کا وقت نہ تھا۔ ملگجے دوپٹّے کو پھینک کر، ایک نیا تہ کیا ہُوا دوپٹّہ اُوڑھتے وقت، اُس نے پھر خدمت گارنی پر ایک شبہ کی نظر، (ایک نظر جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اب تک یقین نہیں کرتی کہ حقیقتاً کوئی گھر والی بی بی اُس کے پاس آئی ہے) ڈالی۔ کمرے میں سے پنجوں کے بل چل کے وہ بیٹھک کے کمرے میں، جس نے بُرقع والی بی بی اب تک نہ دیکھی تھی، آئی۔ دیکھا، حقیقتاً ایک بُرقع والی بیٹھی تھی۔ بیٹھی تھی، غلط قلم سے نکل گیا، اِس گھر میں بیٹھ کر وہ

اپنے کو ناپاک نہ کرنا چاہتی تھی، گو محبت اُسے اس گھر کی گلا گھونٹنے والی ہوا میں سانس لینے پر مجبور کر رہی تھی، تاہم پاؤں کے سوا اور کوئی عضو یہاں کی چیزوں کو نہ چھوئے گا۔

اُس نے اُس کی پذیرائی کے لئے، بالوں کو ذرا سنوارنے دوپٹے کو اُلٹنے سے نہیں بلکہ باقاعدہ اوڑھنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئی نوجوان عورت نے جو ایک ہیکلِ مہیب عدالت بنی کھڑی تھی، اس وقت بُرقع اُٹھایا، اور آسمان سے اُترنے والی ایک نگاہ عصمت سے اس بیسوا کو جس نے اُس کی زندگی کی خوشی کو برباد کر دیا تھا دیکھا۔ یہ باوقار عورت جس کی ہر سانس، ہر نظر، ہر حرکت سے باعصمت بی بی اور ماں ہونے کی قدسی اور علوی صفت ظاہر ہو رہی تھی، اس بیسوا کے مقابلہ میں کھڑی ہو کر اس کی زندگی کی مذلّت کو اور بڑھا رہی تھی۔ وہ اِس سے متاثر ہو کر پوچھنے لگی۔

"آپ مجھے چاہتی تھیں، بیگم صاحب؟"

اُس نے آنکھوں سے شرارے برسا کے، بلا تردّد جواب دیا:-

"ہاں تمہارے، نہیں تو بہ، برسوں سے مجھ سے چھینے ہوئے خاوند کے لئے آئی ہوں۔" اس آواز میں ایک عزم آہنیں کی قوت ایک حکم عدالت کی مہابت موجود تھی۔ اُدھر والی فوراً سمجھ گئی اور اپنے دل میں کہنے لگی "اوہو، یہ اُن کی بیوی ہے، لیکن حسین ہے، ہرگز بُری نہیں" اب یہ دونوں عورتیں۔ جو ہر چیز سے پہلے عورتیں تھیں۔ تیز نگاہوں سے ایک دوسرے کا معائنہ کر رہی تھیں۔

اُدھر والی نے ایک نگاہ میں دیکھ لیا، کہ اس عورت میں جو اپنا خاوند مانگنے آئی ہے ایک حُسن تھا، جو اس صنف میں نہیں نظر آتا جس سے کہ وہ خود منسوب تھی، ایک عادی حُسن تھا جو صرف عصمت دار عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

ایسی آواز سے جس سے ایک ادائے استہزا ظاہر ہوتی تھی اُس نے جواب دیا: "اپنے شوہر کو مجھ سے چاہتی ہو مگر بی بی جان! آپ غلطی پر ہیں، میں نے کسی کے شوہر کو ضبط نہیں کر لیا۔"

وہ اس جواب کی پہلے ہی متوقع تھی، اس کے سُنتے ہی اُس نے تار باندھ دیا: "آخر اس کی کیا ضرورت ہے؟ جھوٹ بولنے کی کوئی

حاجت نہیں۔ میں تم سے یہاں لڑائی لڑنے نہیں آئی ہوں یقین مانو
تم سے بیر رکھنے کا بھی میں اپنے میں کوئی حق نہیں دیکھتی۔ میں جو آئی
ہوں تو اس لئے کہ اب بھی شاید تمہارے دل میں وہ چیز باقی ہو جو
ہم سب کا حصہ ہے۔ میں تمہیں تریا ہرٹ کا نہیں، نہ پا پریم کا واسطہ
دیتی ہوں۔ سمجھتی ہو میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟ میں تم سے اپنا خاوند
چھیننے نہیں آئی کیونکہ اپنے میں اس کی نہ قابلیت، نہ طاقت پاتی
ہوں میں اُسے مانگنے آئی ہوں۔ تمہاری ہتھیلی میں اسوقت ایک
بہت بڑی چیز ہے۔ ایک گھر کا چین، ایک خاندان کا آرام تمہاری ہتھیلی
میں ہے اُسے چاہے مسل دو، چاہے چھوڑ دو۔ ان آنکھوں کو جو
برسوں کے رونے سے تر ہو رہی ہیں تم سُکھا سکتی ہو۔ اُس سے تمہارا
علاقہ کیا ہے۔ کس طرح شروع ہوا، اب کس رنگ میں ہے۔ میں اس کا
کھوج نہیں لگانا چاہتی۔ یہ جانتی ہوں کہ وہ اس وقت مجھ سے زیادہ
تمہارا ہے۔ مجھ سے بھاگ کے تمہارے پاس آتا ہے۔ حالانکہ وہ میرا
شوہر ہے، اُسے صرف میرا ہو کے رہنا چاہیئے۔ میرے سوا، اُس پر
کسی کا حق نہیں، میرے سوا، وہ کسی کی ملکیت نہیں، کسی کی امانت

نہیں۔ تم عورت کے دل کی باتیں شاید سمجھ سکتی ہو گی؟ سمجھتی ہونا؟ ہائے کہیں سمجھو۔ تم نے میرا شوہر لے کر مجھ سے کیا کیا لے لیا۔ گھر بھر کا امن گھر بھر کا چین لے لیا۔ وہ کل رات، اور بہت سی راتوں کی طرح یہاں تھا، اُس نے ساری رات شاید کیا یقیناً تمہارے ہاں گزاری، شاید تم جو مجھ سے ملنے اس کمرے میں آئیں، تو اُس کے پہلو سے اُٹھ کے آئیں۔ لیکن جانتی ہو کہ اس کی بیوی نے یہ رات کیوں کر کاٹی، یہی رات نہیں، اسی طرح کی اور سیکڑوں راتیں کس طرح کاٹیں جہنم میں انگاروں پر لوٹ لوٹ کر کاٹیں، میری پانچ برس کی۔ ہاں سُنتی ہو، میرے پاس پانچ برس کی ایک ننھی بھولی جان بھی ہے۔ وہ بھی رو رو کے، بابا کا انتظار کر کے سوئی ہے۔ البتّہ تمہیں خبر نہیں، کہ گھر میں یہ کیفیت کیسی مصیبت کی کیفیت ہے اگر تم جانتی ہوتیں تو تم ضرور اُس سے کہتیں: "جاؤ میرے پاس سے جاؤ تمہارے گھر میں جو عورت تمہارا انتظار کر رہی ہے، جو بچّی تمہارا انتظار کر رہی ہے اُس کے پاس جاؤ میں اُن کے بلکنے کا سبب نہیں ہونا چاہتی"۔ ۔ ۔ ۔ جواب نہ دو، تمہاری آنکھوں کا نیچا ہونا ہی کافی جواب ہے۔ تم جس زندگی

کاٹنے پر مجبور ہو۔ شاید اُس زندگی نے بھی تمہاری طبیعت کو بالکل مسخ نہ کر دیا ہوگا کیونکہ تم عورت ہو، اور عورت سے عورت پن کب جا سکتا ہے۔ ہر عورت کی طبیعت بیوی بننے، ماں بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ مجھے یہاں تک لانے والی، تمہاری خوشامد کرانے والی چیز یعنی بچّے کی محبّت شاید تم میں بھی ہو۔"

یہ کہتے ہوئے اُس پر رقّت طاری ہونے لگی، اور وہ یہ بھول گئی کہ وہ ایک فاحشہ کے مقابلہ میں ہے، اور طبیعت پر قابو میں ذرا سی کمی آنے لگی، آوازیں، باوجود بے انتہا ضبط کے کچھ بھرّاہٹ پیدا ہو گئی، فقرے دل میں چشمے کی طرح اُبل رہے تھے، وہ کم کہنا چاہتی تھی، مگر زیادہ کہہ رہی تھی۔ اُدھر والی، اس پُرجوش، پُرخروش دلی تقریر کے سامنے چُپ کھڑی تھی، اور نہیں جانتی تھی کہ کیا جواب دے، کبھی کبھی "لیکن میں" "مگر وہ" سے کچھ فقرہ شروع کرنا چاہتی، مگر اس بدبخت بیوی کے مقابلہ میں جو اُس کے سامنے اپنے تمام عذاب زندگی کے ساتھ فریاد قلب کر رہی تھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔

ایک دم، یہ مغلوبیت اُس کے نفس پر گراں گزری۔ اس عورت کے سامنے اپنے تئیں مقابلہ سے عاجز دیکھ کر، اس عصمت کے حضور میں اپنی ذلتِ فحش کو بداہتاً محسوس کر کے، اس کے دل میں ایک طغیانِ غرور اُٹھا، اور اُس قلب میں جس میں ذرا کی ذرا کو عورت پن کی حسیات مرحمت اور رقّت پیدا ہوئی تھیں یکایک تمام حیات فاحشہ جاگ اُٹھی۔ اور اس نے اس حس سے مغلوب ہو کر اس عورت کو جو اُس آدمی کی اس قدر فریفتہ معلوم ہوتی تھی۔ حقارت آمیز جواب دینے کا ارادہ کر لیا اور کہا:۔

سُبحان اللہ آپ کی بھی نرالی باتیں ہیں۔ مجھ سے آکر اپنا خاوند مانگتی ہو، اگر ایسی ہی ضرورت ہے، تو اُسے پکڑ کے رکھنے، اپنا کر کے رکھنے کی تدبیر کیوں نہیں سوچتیں "

نوجوان عورت نے دیکھا کہ سامنے والی اب وہ عورت نہیں جس میں حسّ نسوانی پیدا ہو رہا تھا، بلکہ اب وہ ایک عورت ہے جو ایک فاحشہ کی صفت سے متصف ہو کر لڑائی لڑنا چاہتی ہے۔ اُس نے ذرا اونچی آواز سے جواب دیا۔

"مجھ سے پہلے تم نے اُسے اپنا کر لیا، اپنے ساتھ باندھ لیا تھا؟ پھر کیوں پوری محافظت نہ کی۔ کیوں اُسے اجازت دی کہ وہ جا کر ایک جوان لڑکی کی زندگی تباہ کر دے۔ تمہیں اُسے پکڑ کے رکھنا چاہئے تھا۔ نہ اُسے پکڑ کے رکھتی ہو، نہ چھوڑ دیتی ہو۔ میں اپنے میں اتنی قوّت نہیں پاتی، وہ چلتر نہیں جانتی کہ اُسے تمہارے پنجوں سے چھڑاؤں"۔

اُدھر والی، اب کونے میں سے ایک مونڈھا کھینچ کر اُس پر بیٹھ گئی اور پاؤں پر پاؤں رکھ کے اُنہیں ہلانا شروع کیا، اور ایک مستہزی اور بے اماں نظر سے نوجوان عورت کو دیکھنے لگی۔ ایک دو منٹ تک خاموشی طاری رہی، دونوں سوچ رہی تھیں کہ ان باتوں کا انجام کیا ہوگا کہ اتنے میں مونڈھے والی نے پوچھا۔

"تو اب میں کیا کروں؟ ہر شام بیگم صاحب کے گھر، اُن کے شوہر کو ہاتھ پکڑ کے پہنچا آیا کروں؟"

اس نے اس طعنہ، اس تحقیر پر بھی صبر کیا، ایک مرتبہ پھر اُس کی نیکی طبیعت (اگر اُس میں نیکی طبیعت وہ جانے کا احتمال باقی

ہوا سے اپیل کرنے کا ارادہ کیا :-

"کیوں یوُں مجھ پر فقرے کستی ہو میں نے شروع ہی میں کہدیا تھا کہ تم سے لڑنے نہیں آئی ہوں۔ میں جو تم سے مانگتی ہوں، جو تم سے اُمید رکھتی ہوں وہ ایک سادی سی بات ہے تم اُس آدمی کو چاہتی نہیں۔ یا کیسے کہوں، وہ بھی تمہارے لئے اور بہت سے آدمیوں کی طرح ایک آدمی ہے! وہ بھی اُن میں سے ایک ہے جس سے تمہارے گھر کا خرچ نکلتا ہے اور بس"۔

اس پر یکایک وہ غصّہ میں آگئی اور کہنے لگی: "میرے گھر میں آکر، مجھ کو ایسی باتیں سُناتی ہو، میری ہتک کرتی ہو، اِیں"

فاحشہ تو غصّہ کے لئے ایک بہانہ ڈھونڈھ رہی تھی؛ "باتیں سُناتی ہو، میری ہتک کرتی ہو" پر ہی اُس نے بس نہیں کیا بلکہ اور بھی بہت کچھ کہہ ڈالا، نوجوان عورت اب تک اپنی متانت قائم رکھے تھی لیکن اب وہ ہاتھ سے چھوٹی جاتی تھی، اور وہ بھی دلی غصّہ سے کانپ رہی تھی، اور اُس کا دل چاہتا تھا (مگر دل کو روکتی تھی) کہ اس بیحیا عورت پر، جو اپنی عادت دیرینہ کے موافق، بغیر سوچے

سمجھے اپنے سینے سے دوپٹہ ہٹاتے ہوئے۔ اول فول بک رہی تھی، حملہ کرکے مونڈھے پر سے گرادے لیکن طبیعت پر جبر کئے ہوئے خاموش کھڑی سن رہی تھی۔ اتنے میں دیکھا کہ خود وہ اٹھی اور اس سے ہاتھا پائی کرنی چاہتی ہے، اس کو دیکھ کر اس کا عزم صبر بالکل جاتا رہا، اور اس نے اونچی آواز سے کہا۔

"ہاں ہاں، میں تمہیں تمہارے گھر میں ایسی باتیں سناتی ہوں، تمہاری ہتک کرتی ہوں، جانتی ہو تم پر عصمت والی بیبیوں محبت والی ماؤں کی لعنتیں، بددعائیں پڑتی ہیں۔ تم جو گھروں کے چین بیبیوں کے آرام کی دشمن ہو، تم جو ہمارے خاوندوں کو ہم سے چرا لیتی ہو ....." یہ کہتی ہوئی کانپ رہی ہے، اور اپنی خلل زندگی کا انتقام اس فاحشہ کی تحقیر کرنے، اُسے سخت سخت باتیں سنانے سے لینا چاہتی ہے۔ اب اُدھر والی بھی مارے غصہ کے پاگل سی ہوگئی : دوپٹہ بدن سے اُتار کر پھینک دیا، اور اس پر حملہ کرنے کے لئے ایک قدم آگے ڈالا، مگر صرف ایک قدم۔ دوسرا قدم ڈالنا چاہتی ہی تھی کہ پیچھے سے فولادی ہاتھوں نے اُس کے

کندھوں کو پکڑ لیا، اس وقت ان دونوں عورتوں نے اُسے دیکھا۔

وہ تھوڑی دیر سے، وہاں، کواڑ کے پیچھے کھڑا اُسن رہا تھا۔

اس بیس منٹ کے زمانہ نے، اس پر تزکیۂ نفس و تصفیہ حیات کے لئے برسوں کی ریاضت کا کام دیا۔ اور اُس نے اپنی نوجوان بیوی کو۔ اس بیوی کو جس کے آنسوؤں کے نشان اب تک اُس کے رُخساروں پر تھے، جس کا صرف غمگین چہرہ کھُلا ہوا تھا، باقی لمبا متناسب الاعضاء لطیف اور شرمیلا جسم بُرقع میں چھپا ہوا تھا دیکھا پھر فوراً نظر اُس دوسری پر پڑی، جو بالوں کو بکھیرے، باسی مُنہ اور مخمور مگر پھٹی آنکھیں لئے ملگجی کرُتی، جو اُوپر کو چڑھ گئی تھی پہنے اس جسم کو ظاہر کر رہی تھی جس کی رگ، رگ سے حیات ملوث افشاء ہو رہے تھے، اور جس کی تمام ہیئت کذائی سے گویا بُوئے فحش کے بھپکے نکل رہے تھے۔ ان دونوں کو مقابل دیکھ کر ان دونوں کا فرق اُس کی آنکھوں میں چُبھ گیا۔ ایک پاک و لطیف، دوسری کثیف و ملوث، ہم جسماً ہم اخلاقاً ملوث!

پھر اپنی بیوی کی آواز کی رقت میں وہ ایک ادائے استرحام

پاتا تھا جو دل کو مسلے ڈالتی تھی، اُس دوسری کی آواز میں بے انصافی، استہزا، گستاخی جرأت چھپی ہوئی تھی جس کو سُن کے وجدان نفرت کرتا تھا۔ اور اُسے ایسا جوش آیا کہ اُسے تھپڑ مار کے گرا دے، اور اس کے قدموں پر گر پڑے۔ اللہ کی پناہ! اس عورت، اس مقدّس اور محترم فرشتہ سعادت کو کس پر قربان کر رہا تھا، کس کے لئے ستا رہا تھا؟ ایک فرسودہ ملوّث مخلوق کے لئے جو سیکڑوں آغوش میں جا کر، متاعِ عشق اور جنس حُسن بیچتی تھی!

ایک منٹ میں وہ آنسوؤں کے دریا جو اُس کی وجہ سے بہے اُس کی نظروں کے سامنے سے گزر گئے۔ وہ تمام بے انصافیاں جو اُس نے اپنی بیاہتا کے ساتھ کی تھیں، اس کی ضمیر پر برچھی کی طرح آکر لگیں۔ اب قلباً اپنے تئیں اس سے کس قدر مربوط، اور اُس سے کس قدر دور پا رہا ہے! جب یہ بات ہے، تو اب تک کونسی چیز مانع ہے، بس انشاء اللہ ایک پھلانگ میں اپنے تئیں اس قعرِ ذلّت سے نکال کر، اپنی زندگی اپنی بیوی بچّوں کے لئے وقف کر دے گا، اور اُس کے پاؤں پر

سر رکھ دیگا۔

یہ سوچ ہی رہا تھا، کہ دیکھا کہ فاختہ اس کی بیوی پر ہاتھ چھوڑنا چاہتی ہے۔ یہ دیکھتی ہی دُنیا، اُس کی آنکھوں میں تاریک ہوگئی، وہ بجلی کی تیزی کے ساتھ کواڑ کھول کے کمرے میں در آیا، اور اپنے آہنیں پنجوں سے اُس کے کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

اور پھر ایک ذرا سا جھٹکا دے کے اُسے اور اُس کے ساتھ اُس کی محبّت کو اپنے سے دُور پھینک دیا، اور پھر اپنی بیوی کے پاس جاکر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اور ایک نگاہ استرحام کے ساتھ جس میں آج کے دن تک کے تمام قصوروں کے لئے طلب عفو آکر جمع ہوگئی تھی، اُس نے بھرّائی ہوئی آواز سے کہا:

"میری خطاؤں کو معاف کردو، میں صرف تمہیں چاہتا ہوں، میں صرف تمہارا ہوں اور تمہارا ہوکے رہوں گا۔"

اور پھر اُس کے چہرے کو جس پر دو آنسوؤں کے قطرے دو قطرۂ سعادت ڈھلک رہے تھے، اپنی طرف کھینچ کے، اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

اور جبکہ وہ فاحشہ اپنے غصّہ اور حسد کو ایک کھسیانی ہنسی سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، اس بیاہے جوڑے نے۔ جن کے درمیان اب تک ایک سرد مہری کی دیوار حائل تھی جسے وہ ہٹا نہ سکتے تھے۔ پاک، صاف، محبّت بھرا بوسہ لے کر گویا دوسری مرتبہ نکاح کیا، اور وہ پیمان وفا باندھا جو اب عمر بھر تک نہ ٹوٹے گا۔ یہ بوسہ اس پیمان وفا کی مُہر تھا۔

حکایۂ لیلیٰ و مجنوں

(۱)

قیس، کمرے میں نہایت غمگین حالت میں بیٹھا تھا، میز پر سے ایک کاغذ کو اُٹھاتا تھا، اُسے پڑھتا تھا، پھر رکھ دیتا تھا۔ پڑھتا تھا، ٹھنڈا سانس بھرتا تھا، پھر رکھ دیتا تھا۔

یہ لیلےٰ کا وائرلیس تھا، جو ابھی ابھی اُسے ملا تھا: "میں کل موٹر کار پر سیر و سیاحت کی غرض سے ایک ہفتہ کے لئے جاؤں گی، ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ جنگل کی خشک ہوا، میری صحت کے لئے مفید ہو گی۔ خدا حافظ، تمہاری لیلےٰ"

بات یہ تھی کہ قدرت نے اس ستم ظریف، مرحمت ناشناس، قدرت نے جو ہم سب کو اپنا بازیچہ بنائے ہوئے ہے۔ بیچارے قیس عامر کو پھر نجد میں لا بٹھایا تھا! مگر کس نجد میں؟ اُس نجد میں نہیں

جو قیس بھولے، سچے قیس کے زمانہ سے لے کر ۱۹۰۰ء تک تھا، اُس نجد میں نہیں جس میں آج تک قیس کی رُوح شادان و فرحاں پھرتی ہے کیونکہ وہ اب تک نجد میں، اپنے زمانے کے صحرا، اپنے زمانے کے ٹیلے، اپنے زمانے کے غزال، اپنے زمانے کی صبا، اپنے زمانہ کا ناقہ، اپنے زمانے کا ساربان پاتی ہے، بلکہ اُس نجد میں جس میں اب ریل تھی تار تھا، موٹر کار تھی، ٹراموے تھی، ترقیاں تھیں، مصیبتیں تھیں۔

اس نجد میں، اس تبدیل شدہ جولان گاہ وحشت میں جس میں اُس نے اپنے عشق اور جنون یا بالفاظ دیگر عشق یعنی جنون، یا جنون یعنی عشق کے دن کس آزادی سے کاٹے تھے، اب وہ پیدا ہوا تھا، اور وہ ہی اکیلا پیدا نہیں ہُوا تھا، قضا و قدر کو اپنا مذاق پورا کرنا تھا، اس لئے عین اُسی زمانہ میں لیلیٰ بھی پیدا ہوئی تھی۔

جن صحراؤں میں وہ غزالوں کو پکڑ پکڑ کے اُن کی آنکھیں چُوما کرتا تھا، کیونکہ وہ لیلیٰ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں ان صحراؤں میں اب وہ عفریت جو آگ کھاتا ہے اور دُھواں اُگلتا ہے، پھنکاریں مارتا ہوا اور بل کھاتا ہُوا، رات دن پھرتا تھا، اور ان بھولے لیلیٰ صفت غزالوں

کو پریشان کیئے ہوئے تھا، اور اب وہ مجنوں کے پاس آنا کیسا، انسان کی صورت سے بھڑکتے تھے، اور اس کی کلفت بار ترقیوں کی نشانیوں سے بھاگے پھرتے تھے۔ قیس کو قضا و قدر کی طرف سے کبھی کبھی یہ علم مل جاتا تھا کہ وہ وہی پرانا قیس ہے، اور اُس وقت وہ اُس زمانہ کو یاد کرتا تھا کہ ناقے کے پیچھے دوڑا دوڑا جا رہا ہے۔ محمل میں لیلیٰ ہے، نہیں بھی ہے تو بھی یہ خیال اس کے دل کو خوش کر رہا ہے کہ شاید اُس کے اندر لیلیٰ ہے، یا اب؟ اب لیلیٰ کا یہ تار ہے کہ اس کی خرمن صبر پر بجلی گرا رہا ہے، دیکھئے، اچھا بہانہ کر کے چلدیں۔ جانتی ہیں: کہ میں تعاقب نہیں کر سکتا، یا اللہ! تو نے حسینوں کو ظالم بنایا تھا، تو عاشقوں کے ستانے کے لئے نئی، نئی ایجادیں تو نہ کرائی ہوتیں، مجھ خستہ جان کے لئے تیز رفتار ناقہ ہی کیا کم تھا کہ اب تو نے موٹر کار ایجاد کرا دیا، صبح وہ چل دیں گی، اور میں، میں اس شہر میں پڑا اسڑا کرونگا، او ستم ایجاد لیلیٰ، اور عاشق کُش لیلیٰ، ریل میں بھی تو بیٹھنے کے نہیں گئی کہ میں اُسی ٹرین میں بیٹھ جاتا" اور پھر ہاتھوں میں اپنا مُنہ چھپا کے سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک دم اُٹھ کھڑا ہُوا، اور میز پر جا کے نوکر کو بلانے کے لیئے برقی گھنٹی بجائی، دس سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ دوسری مرتبہ اور زور سے گھنٹی بجائی۔

نوکر بڑبڑاتا ہوا "خدا خیر کرے: اب تو وقت بے وقت گھنٹیاں بجاتے ہیں، یہ آدھی رات سب سو رہے ہیں، دن بھر تو یوں ہی مجھے ناچ نچاتے رہے، رات کو ذرا کی ذرا آنکھ لگی تھی، کہ لیجئے پھر یہ گھنٹیوں کا تار بندھ گیا، میں باز آیا، اس نوکری سے، اگر ایک ہفتہ اور رہا تو میں بیمار پڑ جاؤنگا، سبحان اللہ اچھا عشق ہے کہ نہ خود چین لیتے ہیں نہ کسی کو چین لینے دیتے ہیں"، کمرے میں داخل ہوا اور کہا: "حضور کیا ارشاد ہے؟"

"ارشاد کیا ہے۔ گھنٹیاں بجاتا بجاتا عاجز ہو گیا، تم سنتے ہی نہیں، کان میں روئی ٹھونس لی ہے یا کیا؟"

"خداوند غلام قصوروار ہے، مگر حضور ہی دیکھیں یہ گھڑی لگی ہوئی ہے، ایک بج کے بیس منٹ آئے ہیں، اس وقت میں نے ہزار چاہا کہ آنکھ کھلی رکھوں مگر جھپک ہی گئی۔"

"اچھا بہت باتیں نہ بناؤ، حاجی جاسم واخوانہ کی دکان

پر جاؤ میری طرف سے بہت بہت سلام کہنا اور کہنا کہ ۲۵ گھوڑوں کی طاقت والی موٹر کار، ایک ہفتہ کے لئے کرایہ پر چاہتا ہوں، ذرا سیر کے لئے جانا ہے، فی الحال تو کرایہ میرے پاس نہیں، واپسی پر انشاء اللہ اُن کا کرایہ فوراً ادا کر دونگا۔"

"حضور، اس وقت دکان کہاں، حاجی جاسم کبھی کے گھر میں جا کر سو رہے ہوں گے۔"

"حاجی جاسم نہیں تو قنبر علی احمد وشر کا ہم کے ہاں جاؤ۔"

"حضور ناراض نہ ہوں، یہ اس قسم کی دُکانوں کے کھلے رہنے کا وقت نہیں ہے، شاید حلوائیوں کی دُکانیں اور ایک آدھ قہوہ خانے اس وقت کھلے ہوں، ورنہ ساری دُنیا سو رہی ہے۔"

"جا نالائق دُور ہو جا، مجھے جواب دیتا ہے، عقل سکھاتا ہے بے ادب کہیں کا۔"

نوکر خلاصی پانے کی ترکیب سوچ ہی رہا تھا، اس نارضی سے دل میں نہایت خوش ہُوا، چپکے سے باہر آ گیا، اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر تو قیس کل نوکروں کی جنس پر، اُن کی بیخ و بنیاد پر لعنت

بھیجتے رہے: "ایک بھی نوکر ڈھنگ سرے کا نہیں ملتا جس کام کو کہو، مین میخ نکالیں گے، جو حکم دو، اُس سے بچنے کے لئے بہانہ ڈھونڈھ لیں گے" پھر کچھ غصہ فرو ہوا تو خود خیال آیا "نہیں تو، بلال کا کہنا ٹھیک تھا، اسوقت بھلا کون دُکان کھلی ہو گی، اور کھلی بھی ہوئی تو کیا فایدہ، والد کی سختی کے طفیل میں کوئی دُکان دار قرض نہیں دیتا، اگر میں خود یہ خواہش کروں کہ موٹر کار خرید دیجئے تو وہ کیا اس خواہش کو پوری کرنے کے روادار ہونگے، ہرگز نہیں، کس مشکل سے تو اُنہوں نے بائیسکل خرید کے دی تھی۔ اب کس مُنہ سے موٹر کار کی فرمایش کروں لیکن ہائے قسمت! میں نے بائیسکل خریدی تو لیلیٰ نے موٹر کار پر توجہ کی، میں کسی طرح بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا؛ وہ اتنے بڑے گھرانے کی، ایسے نازوں کی پلی کہ جس کے ایک اشارہ پر سینکڑوں ماما ئیں، خادمائیں دوڑی آتی ہیں، بھلا مجھے کب خاطر میں لاسکتی ہے، یہاں نصیب میں ایک بلال ہے وہ بھی بڈھا سُست، یہ بھی ہم مکتبی کے حقوق کا خیال ہے، جو وہ مجھ قسمت کے مارے پر اتنی توجہ، توجہ کیسی، اتنی عنایت، میں عنایت کا کب سے مستحق ہو گیا، اتنا رحم کرتی ہے

کہ کبھی کبھی ایک نگاہ غلط انداز سے مجھے دیکھ لیتی ہے۔ آہ لیلیٰ! میں تیرا شکریہ ادا نہیں کر سکتا، تو نے مجھے تار بھیج کے اپنے ارادے سے اطلاع تو دی، اگر بغیر اطلاع دئے ہی چلی جاتی تو میں کیا کر لیتا، موٹر کار کی آرزو! ہشت! میں بھی کیسا بیوقوف ہوں، آج وہ موٹر کار پر سوار ہو کر جاتی ہے تو میں موٹر کار کے لئے مر رہا ہوں اچھا اگر کہیں کسی ضرورت سے اُس نے کل اسپیشل ٹرین چھڑا دی تو میں اسپیشل ٹرین کہاں سے لاؤنگا کیوں جناب قیس صاحب! اب آپ سمجھے، آپ زیادہ ریس نہ کیجئے! باز قدر خود بشناس"

اسی طرح قیس اپنے دل کو سمجھاتا تھا، تھوڑی دیر تو وہ ساکن بیٹھا، لیکن پھر بیٹھا نہ گیا، آدھی رات، گھر بھر میں سناٹا (قیس کے والد نے ایک مختصر سا گھر، اپنے گھر سے ملا ہوا قیس کو دے رکھا تھا) مگر قیس کوٹھے سے اُتر کے نیچے آیا، اور ایک کمرے میں جو کباڑ خانہ تھا، جا کر چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا ڈیڑھ دو گھنٹے کی محنت کے بعد، اپنی بائیسکل کو تیل وغیرہ ڈال کے درست کیا اور نہایت بیتابی سے صبح کا انتظار کرنے لگا، پو پھٹی، اور قیس

بائیسکل پر سوار گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

(۲)

قیس بائیسکل پر سوار گھر سے نکل کھڑا تو ہوا، لیکن شہر سے باہر پہنچتے ہی سوچنے لگا "کدھر جاؤں، مختلف سڑکیں مختلف سمتوں کو جارہی تھیں، کدھر جانا چاہیئے؟ یہ ظاہر ہے کہ اُدھر جانا چاہیئے جدھر لیلیٰ گئی ہے، مگر خود لیلیٰ کس طرف گئی ہے، اس کا کس طریقہ سے پتہ لگائیے، لیلیٰ کے گھر جاکر دریافت کرے، مگر وہاں تو اس کی پذیرائی خاص طور پر ممنوع ہے، یہی تعجب ہے کہ وہ کس طرح تار بھیج سکی، پرسوں ہی تو وہ خط جو اُس نے، اُس کے نام بھیجا تھا، واپس آگیا تھا، اور اُس پر لیلیٰ کے والد کے ہاتھ کا یہ لکھا ہوا تھا "قیس کو معلوم ہو کہ باوجود منع کرنے کے، خط بھیجے جانا، اُس کے حق میں مفید نہ ہوگا، وہ متنبہ کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی بے سود اور غیر شریفانہ کوششوں سے باز آئے"۔ باوجودیکہ اُس نے لفافے پر اپنا نام نہیں لکھا تھا، نہ اندر اپنا نام لکھا تھا لیکن لیلیٰ کا باپ؟ اور اُس کا خاندان نہایت ہوشیار تھا اور اس کا خط پہچان لیا جاتا تھا۔ آہ! اس خط کے پکڑے جانے پر،

نہ معلوم بیچاری لیلیٰ پر کیا کیا ستم نہ ڈھائے گئے ہوں گے۔ مگر واہ ری عاشق نواز لیلیٰ! تو نے پھر بھی جادۂ وفا سے قدم نہ ہٹایا اور نہ معلوم کن خطروں میں پڑ کر، اور خدا ہی جانتا ہے کہ کن مصیبتوں کا سامنا کر کے وہ تار بھیجا۔ لیکن جہاں اتنی عنایت کی تھی کہ اپنی روانگی سے اطلاع دی تھی، وہاں سمت سفر سے بھی اگر مطلع کر دیتی! تو بندۂ احسان اور احسان مند ہوتا، ہاں مگر وہ تو خود نہیں چاہتی کہ میں تعاقب کروں، کیوں کہ اس تعاقب کا نتیجہ میرے لئے اور اُس کے لئے اچھا نہیں، کچھ ہو، مگر مجھ سے تو اب گھر میں بیٹھا نہیں جاتا، میں جاؤں گا ضرور، چاہے، اُس سے کوسوں دُور رہوں، تاہم پھر وہی سوال ہے جاؤں کس طرف کو؟

اِس کشمکش میں، اِس بیقراری میں، کبھی اِس طرف کو دیکھتا تھا کبھی اُس طرف کو، کہ بادِ صبا جو زمانِ سابق میں لیلیٰ کی زُلفِ عنبریں سے شمیم جانفزا لایا کرتی تھی اپنے ایک جھونکے میں مٹّی کے تیل کی بو لائی، قیس مارے خوشی کے اُچھل پڑا، اوہ آہا پتہ لگ گیا، اسی طرف گئی ہیں۔ پٹرول کی بو صاف کہے دیتی ہے۔ اب ایک منٹ ٹھہرنے کا

وقت نہیں ہے" اور یہ کہہ کے اپنی پوری طاقت سے بائیسکل چلانی شروع کردی۔

مگر جس طرح پیادہ پا قیس، ناقہ سوار، محمل نشین لیلیٰ کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا اسی طرح بائیسکل سوار قیس، موٹر سوار لیلیٰ کی گرد تک نہ پہنچ سکا۔

لیکن تھکن کیا شے ہے، نا اُمیدی کیا چیز ہے، اُسے نہ جاننے والے قیس کے لئے یہ کوئی ہمّت بٹھا دینے والی بات نہ تھی وہ برابر جارہا تھا۔

موانع کی وہ پرواہ نہ کرتا تھا، ایک جگہ راستہ درست کیا جارہا تھا، سڑک پر پتّھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، پتّھر کوٹنے کا انجن، اپنی بھاری بھرکم چال سے، اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھر پھر کر، آہستہ خرام بلکہ مخرام، "زیر قدمت ہزار سنگ است" کی تفسیر کر رہا تھا، "راستہ تعمیر کے لئے بند" کا تختہ لگا ہوا تھا، مگر قیس پگڈنڈی ہی پر سے اپنی بائیسکل لے گیا۔ تھوڑی دور گیا ہوگا کہ بائیسکل کی گھنٹی بگڑ گئی، اس کو پریشانی تھی کہ بغیر گھنٹی کے کس طرح گزر ہوگا ہم سڑک پر چھکڑے، اونٹ، گائے، بھینس، قطار در قطار تھے

تھے، اگر گھنٹی یا بلوانگ ہورن نہ ہوا تو بائیسکل چلانا قطعاً غیر ممکن ہوگا کہ اتنے میں ایک گاؤں والا نظر پڑا جو ٹوکرے میں چند بطخوں کو رکھے لئے جا رہا تھا، بطخوں کی "قیں قاں" سے کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی دیوانہ بکارِ خویش ہشیار قیس کو فوراً ایک ترکیب سُوجھی، گاؤں والے کو آواز دے کر ٹھہرا لیا اور اُس سے بطخوں کا ٹوکرا خرید کر ہینڈل پر باندھ لیا۔

"قیں، قاں، قیں قاں، قیں، قیں، قیں" راستہ میلوں تک صاف تھا! سڑک چکر کھاتی ہوئی دُور تک جا رہی تھی! صبح کا، نجد کی صبح کا (لندن یا کلکتے کی گلا گھونٹنے والی صبح کا نہیں) سہانا وقت تھا، اور ریگستان کی خشک اور ٹھنڈی ہَوا، وہ ہوا، جو اپنی صفائی کے لحاظ سے ان مرطوب بادلوں والی ممالک معتدلہ و باردہ کی ہواؤں پر ہنستی ہے، وہ ہَوا جو عاشق مزاج، شاعر طبیعت، زن دوست، موت سے نڈر آدمی، اور شرف بخش حیوانیت یعنی اصیل اور شریف گھوڑے پالتی ہے، وہ ہَوا جو راجپوتانہ میں راجپوت جیسی غیوُر، اور حجاز اور نجد میں عرب جیسی شجیع ملت پیدا کرتی ہے، سائیں، سائیں چل رہی تھی، نسیم صبح قیس کے پُر لئے

ے بگل کی صوت کی چیز جو بائیسکل پر لگی ہوتی ہے اور جسے دبا کر بائیسکل سوار لوگوں کو متنبہ کرتے ہیں۔

دوست ببولوں کو (جو سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے تھے) ہلا رہی تھی ببول، راستہ میں قیس کے شرف میں، اپنے پُرانے دوست قیس کے اعزاز میں پھول بچھا رہے تھے، قیس کی بائیسکل اس زور سے جا رہی تھی پہیے اس تیزی سے چکّر کھا رہے تھے کہ پہیوں کی تیلیاں نظر نہ آتی تھیں بلکہ ایک مسطح دائرہ گھُومتا نظر آتا تھا۔

سڑک پر سناٹا تھا، بس کہیں کہیں بیچ سڑک میں، گلہری اپنے اگلے پنجوں میں کوئی بیج لئے کترتی نظر آتی تھی، لیکن اس بائیسکل سوار عاشق کو دیکھ کر "چک" "چک" گویا "جائیے جائیے اپنے محبوب کی تلاش میں جائیے مگر مجھے تو نہ ستائیے"، کہتی ہوئی ببول کے درختوں پر چڑھ جاتی تھی، یہ جاں بخش ہوا، یہ سماں قیس کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہا۔

سواری کی ریاضت سے خون رگوں میں تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا، چہرے پر سُرخی تھی اور دل بے اختیار کچھ گانے کو چاہتا تھا، تھوڑی دیر تک تو قیس، سیٹی بجا بجا کے، دل کی خواہش پوری کرتے رہے، پھر یکایک پوری آواز سے آلاپنے لگے ؎

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

کہ دھرڑرڑ ۔۔۔فٹ

قیس کے قدیمی دشمن نے اپنا کام کیا۔ خارِ مغیلاں نے بائیسکل کے ربڑ میں سوراخ کر دیا، اور اِس طرح اپنے پُرانے فرض کو باحسن طریق انجام دیا۔

قیس کے تلوے نہ ملنے پر، یہ اُس کا انتقام تھا، قیس کی کہنی اُکھڑ گئی تھی، اور بائیسکل ٹُوٹ گئی تھی۔

(۳)

ان نصیبوں پر کیا اخترشناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

یہ شعر تو نہیں، مگر اس شعر کے ہم معنی خیالات کا ہجوم قیس کے دل و دماغ پر ہو رہا تھا، کیونکہ یہی مصیبت کیا کم تھی کہ لیلیٰ کی محبت اُسے چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی، اس پر مصیبت مزید یہ کہ کبھی کبھی اُسے اسکا علم ہو جاتا تھا کہ وہ اپنی پچھلی زندگی کی تکرار کر رہا ہے، اُس پُرانے زمانے کو

نئی شکل میں دُہرا رہا ہے، اُس کے آئینہ قلب پر، ہزار برس قبل کے نجد اور اس قدیم نجد میں، اس کی قدیم زندگی کا انعکاس ہوتا تھا، یہی نہیں ہر مشرقی ملک کے لٹریچر میں فسانوں میں، نظم میں، نثر میں وہ اپنے تئیں جلوہ گر پاتا تھا، کہیں اُس کے ساتھ استہزا کیا جاتا تھا، کہیں ہمدردی ظاہر کی جاتی تھی، کہیں اُسے جھوٹا قرار دیا جاتا تھا کہیں کچھ کہیں کچھ وہ ان سب کو پڑھتا تھا، اور خون کے گھونٹ پی پی کر رہ جاتا تھا۔

یوں تو اکثر اُس کے دل پر چوٹ لگانے کے لئے کوئی نہ کوئی چیز موجود ہو جاتی تھی، لیکن آج ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کل دُنیا نے اُسے ستانے کی سازش کر لی تھی۔

دہلی کے سول ملٹری ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا، بہار کا موسم تھا یعنی جاڑا جا چکا تھا اور ابھی گرمی کی گرما گرمی شروع نہ ہوئی تھی۔ یہ موسم ہندوستان کی سیر کے لئے بہت مناسب ہے قیس اس سے اچھی طرح واقف تھا، کیونکہ اس سے قبل کئی مرتبہ، اپنی خواہش سے، اقربا کے اصرار سے، ڈاکٹروں کی رائے سے وہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی سیاحت کر چکا تھا، اِس دفعہ وہ

ڈاکٹروں کے حکم سے جنہوں نے اس کی بائیسکل کی چوٹ کی وجہ سے لیلیٰ کے تعاقب نہ کرسکنے سے جو مزاج میں حد درجہ کی وحشت پیدا ہوگئی تھی، اُس کے علاج کے لئے سفر ہندوستان تجویز کیا تھا۔ وہ یہاں آیا ہوا تھا۔

یہ موسم دُنیا بھر میں دلکش ہوتا ہے، ہر جگہ زینت بخش عالم ہوتا ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان، خدا کے دیئے ہوئے رُوح پرور مناظر، اس کی عطا کردہ پُرتنعم نباتات وجمادات کی نعمتوں کے علاوہ ہر خوبی کو اپنے ہاتھوں کھو دینے والے ہندوستان میں نیچر کے چہرہ پر غازۂ حُسن نہ پھیر دے۔

تیسرا پہر تھا، قیس ہوٹل میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے بیٹھا ہوا، اخباروں کو پڑھ رہا تھا، اور تھوڑی دیر میں اخباروں کو میز پر رکھ کر، سڑک پر آنے جانے والوں کی سیر کر رہا تھا، پانیر کو پڑھ چکا، تو اُس نے ایک روزانہ اخبار اُٹھایا اور پڑھنا شروع کیا:۔

"ہم اس کے کہنے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کرتے کہ ..... صاحب کا زمانہ اپنے پیشرو کے زمانہ سے انشاء اللہ بہتر ہوگا، وہ پچھلی غلطیاں، وہ ہماری قوم کو تہ و بالا کر دینے والی غلطیاں وہ شاید ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ یقیناً اُن کے زمانہ میں سرزد نہ ہونگی، قوم کی سرداری آسان کام نہیں، لیکن اس مشکل

کام کو..... صاحب انشاءاللہ اچھی طرح انجام دینگے۔

دورِ مجنوں گزشت و نوبت ماست

ہر کسے پنج روز نوبتِ اوست

قیس آگے نہ پڑھ سکا، اس شعر نے اس کے قلب، اُس کے جگر گاہ تک جاکر، اس کے حسیات خفتہ کو جو اس سفر میں اُسے اس قدر نہ ستا رہے تھے پھر جگا دیا، یہ عمر میں پہلی دفعہ نہ تھی کہ اُس نے یہ شعر پڑھا ہو، لیکن اس پر ان دو مصرعوں کا اثر کچھ اور ہی ہوا، کیونکہ آج اُسے پھر یہ علم ہوا تھا کہ وہ وہی پرانا قیس ہے، اور اُس نے کہنا شروع کیا: "یہ کہتا ہے، ہر کسے پنج روز نوبت اوست، یہ نہیں سمجھتا کہ جس مجنوں کے زمانہ کو وہ ختم سمجھتا ہے، وہ بدنصیب اپنی زندگی، اپنی مصیبت بھری زندگی پھر کاٹنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور اس دفعہ کسی کو یقین بھی نہیں آتا کہ یہ وہی پُرانا قیس ہے، اس لئے کوئی اس سے ہمدردی نہیں، کوئی اس کے حالات پر توجہ نہیں کرتا، ہر کسے پنج روز نوبت اوست! اجی ہے ہیں تو جس کی نوبت ختم ہو گئی تھی، سینکڑوں برس کے بعد پھر اُسی سلسلۂ زُلف کا اسیر، اُن ہی بیڑیوں کا قیدی کر دیا گیا۔"

قیس کے دماغ میں یہ خیالات گزر رہے تھے کہ اُس کے کان میں ایک آواز ایک پتلی آواز جو صاف بتا رہی تھی کہ یا لڑکے کی ہے، یا کسی عورت کی پہنچی، اور اُس نے سڑک پر نظر ڈالی، دیکھا کہ ایک تیرہ چودہ برس کا لڑکا معمولی نوکروں کے کپڑے پہنے، ایک ہاتھ سے گیند اچھال اچھال کر دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے، اپنے آقا کے کسی کام پر یا کوئی پیغام، یا پیغام کا جواب لئے جا رہا ہے اور نہایت مزے کے سروں میں گا رہا ہے۔

داستاں میری سُنو قصۂ مجنوں نہ سُنو

وہ بھی کیا قصّہ ہے کہ جس کی کوئی بُنیاد نہ ہو

قیس ایک دم، پاؤں زمین پر مار کے اُٹھ کھڑا ہوا، اور کمرے میں ٹہلنے لگا، اور اپنے دل سے نہایت غصّہ میں باتیں کرنے لگا "ہم اور لیجئے، وہ بھی کیا قصّہ کہ جس کی کوئی بُنیاد نہ ہو، تو یہ کرب مفارقت، یہ صحرا نوردیاں، یہ آہیں، یہ نالے جو میں نے وہاں کئے یہ سب فرضی ہی تھے، گویا میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہی نہیں، گویا ان چھالوں کو کبھی کانٹے نے پھوڑا ہی نہیں۔ ہاں، ہاں یہ سب

غلط، اور یہ صاحبزادے، ان کا قصّہ صحیح، بیشک آپ کا قصّہ صحیح، اس میں شبہ کی گنجائش نہیں، بیشک صحیح ہے کہ کل آپ کی پتنگ کٹ گئی تھی، اور اس کے ساتھ آپ کے مانجھے کی ڈور بہت سی چلی گئی تھی، جس کا آپ کو بہت قلق ہے، بیشک صحیح ہے کہ کل گولیاں کھیلنے میں آپ ہار گئے، اور آپ کی آپ کے رفیق سے خوب لڑائی ہوئی اور اُس نے آپ کو دھپیایا جس سے آپ آدھ گھنٹہ رویا کئے، اور جب اپنے آقا کے پاس آئے تو اُس نے اتنی غیر حاضری پر آپ کو خوب سا مارا۔ بیشک آپ کا قصّہ ترحم انگیز ہے، اور میری کہانی مہمل اور بے معنی ہے، کسی کے سُننے لائق نہیں، سُننے کے لائق کب ہو، بے اصل ہے بے بنیاد ہے، نہیں، نہیں، تم تو بے سمجھے الاپ رہے ہو، اصل مصنّف صاحب کی خدمت میں عرض کرنی چاہئے کہ بیشک آپ نے جو فرمایا درست ہے، کوئی شک نہیں کہ آپ کا قصّہ صحیح کہ گھر میں کل رات سالن ذرا سا جل گیا تھا، وہ آپ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے سارا کھانا زمین پر پھینک دیا، اور اپنی بیوی کی اچھی طرح خبر لی وہ بیچاری سسک سسک کے روتی رہی، آپ اپنی جیب میں پرچہ غزل

ڈال کر، مشاعرہ میں تشریف لائے، اور نہایت فخر سے غزل پڑھی۔ چاروں طرف سے واہ واہ کے طوفان شور افزا میں آپ اور آپ کی غزل غرق ہوگئی۔

اِس شعر پر آپ نے خاص طور پر داد طلب کی اور آپ کو حسب الامر حسب الطلب خاص طور پر داد ملی:

داستاں میری سُنو قصۂ مجنوں نہ سُنو
وہ بھی کیا قصہ کہ جس کی کوئی بنیاد نہ ہو"

آج تمام دنیا نے اُسے ستانے کی سازش کر لی تھی، آج کا دن اُن لمحوں میں سے تھا جب ظالم قضا و قدر اُسے اس بات کا علم دے دیتی تھی کہ وہ وہی پُرانا قیس ہے، اور پھر۔ آہ۔ پھر چور گزن کہ جرّاح و مرہم نہ است، یہ علم اُس سے چھین لیتی تھی، قضا و قدر کی یہ اٹکھیلیاں تھیں، وہ ایک ہاتھ سے خنجر گھپوتی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اُس پر مرہم رکھ دیتی تھی۔

آج خنجر گھپونے کا دن تھا، آج اُس کے آئینہ دل پر، اُس کی پُرانی زندگی کا، وہ ہزاروں برس والی زندگی کا انعکاس ہو رہا تھا اور عین جس وقت اُس کے قلب پر اُس کی زندگی کا انعکاس ہو رہا تھا

دُنیا کی ہر شے اس کے دل پر جان جان کر چوٹیں لگا رہی تھی، وہ لڑکے کے شعر سے ہی بھنّایا ہوا تھا، اور ہوٹل کے کمرے میں ٹہل ٹہل کے یہ باتیں کر رہا تھا کہ ایک اور آواز سُنائی دی۔

ایک یکّہ والا، گھوڑے کو شراق، شراق ہنٹر مارتا ہُوا بے تحاشا بھگاتا، گویا اپنے تئیں یار کی دیوار سے جس قدر جلد اور جس قدر دُور ہو سکے لے جانے کی کوشش کرتا ہوا، یہ گا رہا تھا:

ہم تو مریں گے یار کی دیوار کے تلے
مجنوں کو تھا جنوں جو بیاباں میں مر گیا

اِس شعر نے قیس کے خیالات کی رَو کو دفعتاً اور طرف لے جانا شروع کر دیا: ارادہ نہایت عمدہ ہے، خدا اُس کے ارادے میں برکت دے، اور اُسے یار کی دیوار کے تلے مرنا نصیب ہو، لیکن خود وہ (قیس) بھلا اس خوش نصیبی کی کب توقع کر سکتا تھا، اُس وقت بھی، اُس ہزاروں برس قبل والے زمانہ میں بھی، دیوار کے تلے مرنا کیسا، سایۂ دیوار میں بیٹھنے کی اجازت تک نہ دی جاتی تھی، اور اب تو حالت اس زمانہ سے بدرجہا بدتر تھی، پہلے تو صرف اہل خانہ مانع ہوتے تھے

اب اہلِ خانہ مانع نہ بھی ہوں تو میونسپلٹی نہ اُسے بیٹھنے دیگی، نہ وہاں بستر بچھانے دیگی۔ "ہم تو مریں گے یار کی دیوار کے تلے" یا دیوار کے تلے، بیٹھ کر، دم توڑ دینا، شاید ہندوستان میں ممکن ہو تو ہو، متمدن میونسپلٹی ظالم پابند قانون، میونسپلٹی والے نجد میں تو ممکن نہیں، صرف ایک طریقہ مرنے کا اور ہے لیکن وہ خود اختیاری نہیں، وہ دیوار کی عنایت پہ منحصر ہے، یعنی وہ جب یار کی دیوار کے تلے سے گزرتا ہو، تو وہ (یعنی یار کی دیوار) لطفاً و مرحمتاً اُس پر گر پڑے، اور اِس طرح وہ دیوار کے تلے دب کر مر جائے لیکن یہاں بھی وہی ظالم میونسپلٹی کا پاؤں اڑا ہوا ہے، اوّل تو اہلِ خانہ خدا کے فضل سے ہمیشہ مکان کی مرمت کراتے رہتے ہیں، بالفرض وہ بھول بھی جائیں تو میونسپلٹی اگر کسی دیوار کو خطرہ کی حالت میں دیکھتی ہے تو وہ اُسے گروا کے نئی اور مضبوط دیوار بنوا دیتی ہے۔

اِس طرح یکہ والے کے طعن نے جو اس کے دل پر برچھی لگائی تھی، اس کی چبھن کو گھٹانے کی، لڑکے نے جو چرکے لگائے تھے، اُن کی سوزش کو کم کرنے کی منطق اور دلائل سے کوشش کر رہا تھا،

اِس ہجوم طعنہائے شعرا کے مقابلہ میں جو اُس نے اپنی قوت صرف کی تھی، اُس سے وہ تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا، آخر کمرے میں نہ ٹہلا گیا، کرسی پر گر پڑا، اور اِس طرح بے حس و حرکت گر پڑا گویا اس کے اعضا بے حرکت تھے، نہ صرف یہ بلکہ دماغ بھی ساکن تھا، دماغ جو اِس قدر پُر شدت خیالات کا جولانگاہ رہا تھا، اُس وقت اپنے میں کسی خیال کو جگہ دینے سے انکار کر رہا تھا۔

حس اور جسم کی اس عطالت نے اس پر اپنا جاں بخش اثر کیا، اور تھوڑی دیر میں وہ تازہ دم ہو کے اُٹھ بیٹھا، خالی کس سے بیٹھا جاتا ہے، پھر پاس کی میز سے ایک اخبار اُٹھایا۔ "یہ مخزن تھا" یونہی بغیر کسی مقصد کے ورق اُلٹ رہا تھا کہ اس کی نظر کو آخری صفحوں پہ غزل کے لفظ نے اپنی طرف مائل کیا۔

یہ نیرنگ کی ایک غزل تھی۔ مقطع تھا:

پھر ہوئی لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ

اُن کا عالم وہی، نیرنگ کا نقشہ ہے وہی

مقطع کو پڑھ کے اُس کی طبیعت کو بہت خوشی ہوئی۔

"پھر ہوئی لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ! خدا بھلا کرے تیرا نیرنگ!
اگر کسی شخص نے حقیقت کو بیان کیا ہے، یا زیادہ صحیح یہ کہ کتمانِ حقیقت
سے گریز کیا ہے، تو وہ نیرنگ ہے۔ جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْرًا لجَزاء
دوسرا مصرع، میں نہیں کہتا کہ غلط ہوگا، ممکن ہے کہ نیرنگ کا نقشہ
میرے ہی نقشہ کی طرح ہو، اِس لئے مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں
میں تو صرف پہلے مصرع کے لئے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

قدر، برچھیاں کھبونے سے فارغ ہوکر، اب مرہم
رکھنا چاہتی تھی، ورنہ کیا وجہ ہے کہ اس شعر نے قیس کو
خوش کیا۔

تھوڑی دیر میں قیس، وہی سادہ قیس تھا، اور اُسے پچھلے
واقعات کا ذرا سا بھی علم نہ تھا۔

اب قیس کی طبیعت اس قدر بشاش تھی کہ اس سے کمرے
میں یُوں تنہا نہ بیٹھا گیا۔

فلالین کا سُوٹ پہن کے اور ٹینس بیٹ ہاتھ میں لے کر،
قیس باہر آیا اور مغرب تک ٹینس کھیلتا رہا۔

(۴)

مغرب کے بعد قیس ہوٹل میں داخل ہوا، آج کی رات یہاں ایک جلسہ تھا، اور قیس اس میں مدعو تھا، ڈرائنگ روم روشنی سے جگمگا رہا تھا، لیڈیوں کی ریشمی گونوں کی سرسراہٹ، باریک لوچدار قہقہوں کی پُرترنم آواز، دستی پنکھوں کا جلد جلد ہلنا، اور اس طرح اُن پُرزینت چہروں کو، جو نہایت کوششوں اور گھنٹوں کی عرق ریزی سے اسوقت کے لئے آراستہ کئے گئے تھے کبھی چھپا دینا، کبھی جھلک دکھا دینا، یا یُوں کہنا چاہئے کہ چاندوں کا جو کسی درخت کے نیچے سے دیکھے جا رہے ہوں، کبھی پتّوں میں چھپ جانا کبھی ظاہر ہو جانا، سفید براق گردنوں پر موتیوں کے ہاروں کا چمکنا، کسی خوش قسمت سے ہاتھ ملاتے وقت برقی روشنی کا، لیڈی کے ہاتھ کی انگوٹھی پر پڑ کے دمکا دینا کسی کونے سے برقِ تبسم کا گرنا، کسی صوفے سے نغمۂ خندہ کا اُٹھنا، ایک ایسا دلفریب منظر تھا کہ بہت سے لوگ جو اُس "ڈرائنگ روم" میں تھے، بات کر کے بھی خلل انداز نہ ہونا چاہتے تھے، پلک جھپکا کے بھی اس نشہ کو جسے وہ آنکھ کے ذریعہ سے پی رہے تھے، ایک لمحہ بھر کے لئے بھی کم نہ کرنا چاہتے تھے، بلکہ آرام کرسی یا کسی صوفے پر سر کو ٹیکے، اس فردوس نگاہ

و جنت گوش میں بے حس و حرکت پڑے تھے۔

وہ انسانی تیتریاں جنہیں لوگ غلطی سے، غلطی سے نہیں طبیعت کے ٹھوس پنے سے "عورت" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ متحرک تھیں۔ بھونرے سارات کا سیاہ لباس پہنے ہوئے (مرد بھونرے ہی کے لقب کے مستحق ہیں) بھی متحرک تھے، کہیں ایک بھونرے کے گرد دو تین تیتریاں تھیں کہیں ایک تیتری کے چاروں طرف تین چار بھونرے جمع تھے۔

قیس اس بزم کے کنہیا تھے، سب کی آنکھیں ان پر پڑ رہی تھیں۔ سب لیڈیوں کے لئے اُن میں کشش تھی، غیر ملک کے آدمی کی طرف ہر شخص مائل ہوتا ہے۔ عرب، پھر نجد کا عرب کس کے لئے عجوبہ نہ ہوگا، ان کی طبیعت اس وقت خاص طور پر بشاشں تھی، نجد کا حال بیان کر رہے تھے، لوگ سوالات کر رہے تھے، وہ اُن کا جواب دیتے تھے، مگر ایک نوجوان ہیجدہ، نوزدہ سالہ، سیاہ پلکوں والی سیاہ بالوں والی، لڑکی جو زرّیں تاجوں یعنی سُنہری بالوں۔ مذہب تیتروں یعنی سُنہری پلکوں والی لیڈیوں میں ایسی ہی عجیب معلوم ہوتی تھی، جیسا اُن مغربیوں میں، قیس جیسا مشرقی، ایک غیر معلوم کشش سے قیس کو اپنی

طرف کھینچ رہی تھی اور خود قیس کی طرف کھینچی جا رہی تھی، قیس کی باتوں میں بیحد دلچسپی، اُس لڑکی کے پُر اشتیاق چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی، کوئی اور سوال کرتا تو قیس جواب تو دیتے اور اچھی طرح جواب دیتے، غیر تسکین بخش جواب دینا تو اخلاق و نزاکت طبیعت کے خلاف تھا، مگر کچھ بہت خوشی سے جواب نہ دیتے، لیکن اگر یہ لڑکی سوال کرتی (اور اَور سائل ذرا فرصت دیتے تو یہ سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتی تھی) تو قیس اس طرح جواب دیتے گویا اُن کی تمام رُوح، اُن کی تمام قابلیت، خوش کرنے کی تمام قوت و خواہش، اس جواب میں آکر جمع ہو گئی ہے۔ اَوروں کو جواب دیتے وقت بھی، اُن کی نظر دُزدیدہ نظر، اُن سیاہ پلکوں، اُن چمکدار پُتلیوں اور نرم سیاہ بالوں ہی میں جا کر پھنس جاتی تھی، اور وہاں سے واپس نہ آنا چاہتی تھی، اور اگر خاص اس کے جواب میں اس کو مخاطب کرنا ہُوا تو پھر اُن کی نظروں میں گویا کمرے بھر میں کوئی اور ہوتا ہی نہ تھا، اور اس لڑکی میں بھی ان گھنی سیاہ پلکوں، اور سیاہ چمکدار پُتلیوں اور نرم سیاہ بالوں کا، قیس کے لئے کوئی ایسا سحر تھا، اور اس کے دماغ پر ایسا اثر کرتا تھا کہ اُسے

یہی چیزیں اس کے سامنے تیرتی اسکے دماغ میں چکر کھاتی معلوم ہوتی تھی۔

لڑکی کا چہرہ نہایت دلکش تھا، لیکن قیس کے سطح دماغ پر اُس کے چہرہ کا نقش نہیں جم رہا تھا، بلکہ وہ ہی گھنی سیاہ پلکوں، سیاہ پُتلیوں اور سیاہ ریشمی بالوں کا۔

ان میں اُس کے لئے کچھ ایسی کشش تھی کہ اس کی نظر سکڑ سکڑ کے انہیں پر جمع ہو جاتی تھی، اور دوسری چیزوں پر، چہرے پر رُخساروں پر پڑنے سے بھی ابا کرتی تھی۔

ایک طرف سے تجویز ہوئی۔ قیس کو اتنا ہوش نہ تھا کہ معلوم ہو کہ کس نے تجویز پیش کی اور کیا تجویز تھی، صرف لوگ اُس کے پاس سے ہٹتے نظر آئے۔ کہ پیانو کا شغل کیا جائے، عورتیں اور مرد پیانو کے گرد جمع ہو گئے، اُن کے پاس سے بھیڑ چھٹ گئی۔

مگر قیس مسحورانہ وہیں بیٹھا رہا، اُس کی آنکھوں میں وہی سیاہ گھنی پلکیں، وہی سیاہ ریشمی بال چھا رہے تھے، ہاں چہرہ ایک سفید نقطہ کی طرح نظر آتا تھا، پیانو سے آواز نکلنی شروع ہوئی، اور عورتوں کی باریک اور مردوں کی بھری ہوئی آوازیں پیانو

کا ساتھ دینے لگیں، لیکن اس کی آنکھوں میں وہی سیاہ گھنی پلکیں وہی سیاہ چمکدار پُتلیاں، وہی سیاہ ریشمی بال اِس طرح چکّر کھا رہے تھے، جیسے شراب کے نشہ میں سامنے کی چیزیں پھرتی اور دُھندلی دُھندلی نظر آتی ہیں۔

اُن دُھندلی دُھندلی سیاہ چیزوں میں وہ سفید نقطہ جو اُسے اپنی طرف اس قدر مائل کئے ہوئے نہ تھا، بولتا نظر آیا، اور اُس کے کانوں میں یہ آواز پہنچی۔

"مگر مسٹر قیس! آپ نے وہاں کی عورتوں کا حال بیان نہ کیا اُن کا حُسن مغربی حُسن سے ضرور فرق رکھتا ہوگا؟"

اس پر وہ چونکا، اور گویا عالم رویا سے عالم بیداری میں آیا، اس وقت اُسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی اُس کے پاس بیٹھی ہے، اور سوال کر رہی ہے اور اس کے گرد اور کوئی نہیں ہے۔

قیس نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر پھیر کر، گویا اپنے دماغ اور دماغ کی کھڑکیوں کو اپنی اصلی حالت پر واپس لانے کی کوشش کر کے جواب دیا:۔

"معاف کیجئے گا، مَیں ایک خیال میں چلا گیا تھا۔ مگر آپ یہاں

کیوں بیٹھی ہیں آپ بھی گانے کا لُطف اُٹھائیے۔"

لڑکی نے جواب دیا "مجھے معاف کیجئے، اگر میں نے اس سوال سے آپ کے لُطف میں خلل ڈالا مجھے خیال نہ تھا کہ آپ حالت استغراق میں ہیں۔"

"یہ معافی مانگنا تو دو طرفہ جاری رہے گا اِس لیئے اس کے ختم کرنے کے لیئے میں کہتا ہوں کہ میں نے معاف کیا، مگر حقیقت میں یہ تو فرمائیے کہ آپ اس وقت جب کہ پیانو آپ کو بلا رہا ہے، اور ہر شخص آپ کی آواز کی حلاوت سے متمتع ہونے کا آرزو مند ہے، میرے پاس بیٹھ کر کیوں آپ اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔"

کہنے کو تو وہ کہہ گیا، لیکن قیس دل میں خدا سے چاہ رہا تھا کہ وہ جہاں تھی وہاں سے نہ ہٹے، اس کی اس خواہش کو لڑکی کے جواب نے پُورا کیا۔

"مجھے اسوقت نہ گانے، نہ گانا سُننے کی خواہش ہے۔ مَیں خوش ہوں کہ اسوقت پیانو نے آپ کے پاس سے بھیڑ کو ہٹا لیا ہے، کیوں کہ لوگ اس قدر آپ سے سوالات کرتے ہیں کہ مجھے کچھ پوچھنے نہیں دیتے آپ بالکل انہیں کے حصے میں آجاتے ہیں، مگر مجھے خوف ہے کہ

ہیں آپ کے پیانو کا لطف اُٹھانے میں حارج ہو رہی ہُوں۔"

"بالعکس آپ نہ سُننے میں مدد دے رہی ہیں۔ میں اس وقت نہ معلوم کیوں، پیانو کیا موسیقی سے بیزار ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرا خیال اس طرف نہ جائے، آپ پوچھئے مَیں خوشی سے آپکے سوالات کا جواب دُونگا۔"

"میں یہی چاہتی تھی کہ نجد کی عورتوں کی کچھ کیفیّت آپ بیان کریں۔ ظاہر ہے کہ مجھے اپنے ہی ہمجنسوں کے حالات میں زیادہ دلچسپی ہوگی یہ بتائیے کہ وہاں کی عورتوں کا اثر مردوں پر ہے یا نہیں، مشرق اس معاملے میں ہمیشہ غرب کا مطعُون رہا ہے۔ اگرچہ مَیں اِن طعنوں کو بہت کچھ بے بنیاد سمجھتی ہُوں، تاہم آپ سے اس کے متعلق ایک جوابِ شافی سُننا چاہتی ہُوں! اُن کے حُسن اُن کے رنگ اُن کے خدوخال کا بھی کچھ حال بیان کیجئے! بلکہ میرا پہلا سوال تو یہی تھا، آپ نجد کے حُسن میں اور میں محض مثالاً کہتی ہُوں یُورپ یا غرب کے حُسن میں کیا مابہ الامتیاز پاتے ہیں، شاید کیا غالباً حُسن تو وہیں کا آپ کی نظروں میں کھبتا ہوگا لیکن اس کھُبنے کی وجہ بھی بیان کیجئے گا۔"

قیس نے ذرا مُسکرا کے جواب دیا "آپ کے سوالات نہایت دلچسپ ہیں، مگر سب ایک ہی دفعہ نہ پوچھ ڈالئے، نجد میں عورتوں کا کیا اثر ہے، اس کا حال تو آپ کو صرف اس مثال سے معلوم ہو جائیگا جو آپ نے ضرور کہیں نہ کہیں پڑھی ہوگی (اگر آپ کو مشرقی لٹریچر ترجموں ہی کے ذریعے سے مل گیا ہے) کہ نجد میں ایک مشہور شخص جو میرا ہم نام تھا، ایک عورت کے عشق میں دیوانہ ہو گیا، بطور استعارہ کے لفظ دیوانہ استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ حقیقت میں وہ فاترالعقل ہو گیا تھا، چنانچہ آج تک کتابوں میں، نظم میں، نثر میں، عُرف عام میں وہ مجنوں ہی کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، جب تک زندہ رہا، اپنی محبُوبہ لیلیٰ ہی کا نام لیتا رہا، اُسی کے خیال کی پرستش کرتا رہا یہ واقعہ ہے خیالی فسانہ نہیں، اُس شخص نے وہ نام حاصل کیا کہ آج میں بھی اس کے ہمنام ہونے پر فخر کرتا ہوں، پس لیلیٰ کا اثر مجنوں پر، نجد کی عورت کے نجد کے مرد پر اثر کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس کی فتوحات کی سب سے بڑی یادگار ہے، خدا ہی کو معلوم ہے کہ اس لفظ "لیلیٰ" میں کچھ جادو ہے یا مشیّت میں یہ لکھا ہے، کہ کسی دل پر سب سے زیادہ قابو پانے والی

عورت نجد میں لیلیٰ ہی کہلائے گی یا گیا۔ میں بھی ر ہیں آپ سے اعتراف کرتا ہوں مگر آپ اپنے تک ہی رکھیئے گا) میں بھی نجد کی ایک ظالم، ظالم کہوں یا مہربان، کیونکہ اُس میں دونوں صفتیں پاتا ہوں) میں بھی نجد کی جس لڑکی کا اسیر ہوں اُس کا نام بھی لیلیٰ ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی "لیلائیں" کتنے "قیسوں" پر نجد میں ظلم کر رہی ہیں: بس یہ سمجھ لیجئے کہ نجد میں اسوقت تک لیلائے نجد کی مٹھی میں نجد کے قیس کی رگ جان و رشتہ قلب ہے"

پیانو کی اور پیانو کے ساتھ گانے والوں کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں اور اونچی ہو ہو کر اس طرف کو جا رہی تھیں، جہاں سے موسیقی اُتر کے اس دُنیا میں آئی ہے۔

مگر قیس اور اُس کی سیاہ آنکھوں والی، سیاہ پلکوں والی، سیاہ ریشمی بالوں والی، سامع کے لئے گویا کمرے میں خاموشی طاری تھی۔

ایسا سامع اور یہ مضمون! یہ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی نے ایک اُستاد فن کی چابک دستی سے (اور کہاں ہے وہ لڑکی جو اس فن میں چابک دست نہیں، ماہر نہیں!) قیس کے دل کے اُس تار کو چھیڑ دیا تھا جس سے سب سے زیادہ رقیق، سب سے زیادہ دل دوز صدا

نکلتی تھی۔ وہ ذرا کی ذرا ٹھہرا، پھر اُس کے چہرے پر، آنکھوں میں ایک ایسی چمک آگئی جو بتا رہی تھی کہ وہ عالم تصوّر میں جس میں وہ اسوقت تھا کسی دل خوش کُن نظارے کو دیکھ رہا تھا۔

لڑکی نہایت شوق سے اس حالت کو دیکھ رہی تھی، اور مخل نہ ہونا چاہتی تھی، کیونکہ وہ سمجھتی تھی، دیکھ رہی تھی، عورت کا دل جہاں محبّت کے لئے آئینہ جم ہے۔ کہ قیس نجد اس وقت لیلائے نجد کی زیارت کر رہا تھا۔

قیس اس عالم سے باہر آیا، اور معذرت خواہی کے لہجے میں کہنے لگا: "آپ میری ان بے موقع خاموشیوں کو خیال میں نہ لایا کریں، یہ میری عادت سی ہو گئی ہے کہ موقع بے موقع تصورات میں چلا جاتا ہوں، آپ حُسنِ نجد کے خد و خال کا حال بھی پوچھتی تھیں، یہ مشکل سوال ہے، کیونکہ جواب میں اتنا کہہ سکتا ہُوں کہ وہ ایسا نہیں ہوتا، ویسا نہیں ہوتا، کیسا ہوتا ہے؟ اس کے ظاہر کرنے کے لئے نمونہ کی ضرورت ہے، اور وہ یہاں میرے پاس نہیں کہنا چاہتا تھا، مگر یہ غلط ہے، اُس کا ہو بہو

نمونہ نہ سہی تو بہت مشابہ نمونہ تو میرے پاس ہے۔ اب اگر اُسے ظاہر کروں تو یقین نہ کیا جاؤنگا، اور اگر نہ کہوں تو ادائے مطلب سے قاصر رہونگا۔

خیر جو کچھ ہو، وہاں کے حُسن کا حال اگر آپ پوچھتی ہیں تو مَیں مختصراً یہ عرض کئے دیتا ہوں کہ حُسن بخدا ایسا نہیں جیسا اس وقت یہاں، اس کمرے میں مشغولِ نغمہ طرازی ہے۔ نجد کی دلبری اُس شکل میں ظاہر ہوتی ہے جو اجازت ہے تشبیہ دوں"؟ "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ جب میں نہایت بیتابی سے سُن رہی ہوں، آپ نے اپنے فقرے کو ناتمام چھوڑ دیا، نجد کی دلبری کس شکل میں ظاہر ہوتی ہے"؟

"جو اس وقت مشغول جرح ہے"۔

اس پر لڑکی کھسیانی سی ہو گئی، اور کہنے لگی: "معلوم ہُوا نجد کے مرد بھی ہمارے مُلک کے مردوں کی طرح چاپلوس ہیں، خوشامدی ہیں"۔

"میں پہلے ہی اس اعتراض کے وارد ہونے کا خوف کرتا تھا، اور وہی ہوا۔ بہرحال اب میں واقعات کو پلٹ تو سکتا نہیں"۔

لڑکی کے اس جواب میں، "تو وہ کیا چیز ہے۔ جو آپ کے جرح کرنے والے کو (بقول آپ کے) لیلئے نجد سے مشابہ کرتی ہے"؟

کھسیانہ پن تو تھا، مگر ایک خوشنودی کی ادا بھی شامل تھی۔

اِس پر وہ جوش میں آگیا اور کہنے لگا۔ "وہ، وہ زلف عنبریں، وہ، وہ گیسوئے مشکیں ہے جو میرے جارح اور لیلائے نجد میں مشترک ہے، وہ، وہ سیاہ تیر ہیں، وہ، وہ سیاہ مگر روشن ستارے ہیں، وہ، وہ غیر قابل بیان دل کشی ہے، جسے میرا نجد میں پلا ہوا دل محسوس کرتا ہے مگر الفاظ میں ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ میں وہاں کے حُسن کو ترجیح تو دیتا ہی ہونگا مگر اس ترجیح کی کوئی وجہ بھی بیان کروں۔ آپ امواج بحر سے پوچھئے کہ چاند کی طرف کیوں کھنچتی ہیں، آپ پروانوں سے، ان میری طرح بیوقوف دلدادوں سے پوچھئے کہ شمع پر آ کر کیوں گرتے ہیں؟ آپ سُورج مکھی سے کہ پرستندۂ آفتاب ہے سوال کیجئے کہ اُس نے آفتاب کو کیوں قبلہ بنا رکھا ہے، جب یہ جواب دے سکیں گے تو شاید میں بھی جواب دے سکوں..... آہ! آہ! توبہ اُف، اُف یا اللہ توبہ ہے......"

قیس یکایک سوفا سے زمین پر گر پڑا، اُس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے، ڈرائینگ روم میں کہ بزم طرب تھا، اک دم کھلبلی پڑ گئی۔

سب اس کے گرد آ کر جمع ہو گئے لیکن بیچارہ قیس بڑی تکلیف میں تھا اُس کی رگیں کھنچ رہی تھیں، ہاتھ اینٹھے جاتے تھے، مجمع میں چند ڈاکٹر بھی تھے، ان کی رائے تھی کہ مرگی کا دورہ ہے، بعضوں نے کہا کہ اختلاج قلب کی علامتیں ہیں۔

دوا کے لئے لوگ دوڑے گئے، کہ اتنے میں قیس کی حالت میں بہتری ظاہر ہونے لگی، اور تھوڑی دیر میں بغیر کسی دوا کے وہ خود بخود اُٹھ کھڑا ہُوا۔

لوگوں کے پوچھنے پر معلوم ہُوا کہ ایسا دَورہ اس سے قبل کبھی نہیں پڑا تھا۔ جہاں تک اُسے یاد تھا یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُس کی یہ حالت ہوئی۔

بہر حال ڈاکٹروں کا ایک مشورت کا جلسہ ہُوا، سب نے مِل کر، طب کی ضخیم کتابوں میں ڈُوبے ہوئے، دُبلے ہوئے پانچ چھ دماغوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مرگی کا دَورہ تھا، اور اس کے لئے علاج تجویز کر دیا!

(۵)

"جناب ایڈیٹر صاحب وزانہ اخبار! آج میں نے ایک ایسا عجیب

نظارہ دیکھا کہ اسے آپ کے ناظرین تک پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتا:"

میں اتفاقاً آج دوپہر کو زووالاجیکل گارڈنز (باغ حیوانات یا عرف عام میں چڑیاخانہ) کی طرف چلا گیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور لاہور کی دُھوپ۔ مشکل سے کوئی آدمی وہاں نظر آتا تھا۔ کہ اتنے میں میری نظر ایک شخص پر پڑی جس نے بے اختیار مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا یہ ایک خوش رو جوان تھا، لباس تو وہی تھا جو آج کل کل ممالک متمدّنہ کے لوگوں کا لباس ہے، مگر چہرہ اور خط و خال صاف بتا رہے تھے کہ ہندوستان کا آدمی نہیں ہے۔ اہالی یورپ کا بھی نقشہ نہ تھا، وہ کرختگی، وہ شان تبختر چہرے سے نمایاں نہ تھی، چہرہ پر ایک غمگینی مگر ساتھ ہی اس کے بلا کی متانت تھی، ایک شعریت تھی جو الفاظ میں نہیں آ سکتی، ایک محزونیت تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دل عمیق تحسّسات کا آماجگاہ رہتا ہے۔ میں نے جلد معلوم کر لیا کہ یہ شخص۔ جو خوشحال اور اچھے گھرانے کا اور اچھی تعلیم پائے ہوئے معلوم ہوتا تھا۔ عرب اور وہ بھی قبلۂ شعرا کعبۂ اُدبا سرزمین نجد کا عرب ہے، میری عربی دانی آج کام آ گئی، اور میں نے وہ کچھ دیکھا اور وہ

کچھ سُنا جواب تک مجھے حیرت میں ڈالے ہوئے ہے، اور خود میں شُبہ کر رہا ہوں کہ آیا میری آنکھ نے غلطی تو نہیں کی، اور میرے کانوں نے دھوکا تو نہیں کھایا۔ یہ شخص بایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں، اور داہنے ہاتھ کا انگوٹھا واسکٹ کی جیب میں ڈالے اور باقی چار اُنگلیاں باہر نکالے، ٹوپی پیچھے کو ڈالے، ایک لااُبالیانہ انداز سے اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھر رہا تھا۔ کبھی اس کٹہرے کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا، کبھی اُس کٹہرے کے اندر کے جانوروں یا پرندوں کو منٹوں کھڑا غور سے دیکھتا تھا۔ ایک دفعہ ایک پارک کے قریب جس کے گرد تار کھنچا ہُوا تھا ٹھٹک گیا۔ اس پارک میں جیسا آپ کو معلوم ہے، ہرن اور اُن کے مختلف اقسام جمع ہیں اس خاص مجموعہ کے لئے لاہور کا باغ حیوانات بالتخصیص ممتاز ہے معلوم ہوتا تھا کہ یہ مجموعہ اس اجنبی کے لئے خاص دلکشی رکھتا تھا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ یہاں بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ دھوپ کی وجہ سے ہرن، دُور درختوں کے سائے کے نیچے کھڑے تھے، لیکن وہ انہیں اپنی طرف بلانا چاہتا تھا، اُس نے اوّل تو ہری، ہری دوب چھانٹ کر

اور اپنے ہاتھ میں لے کر ان کو دکھائی، مگر پارک میں دوب کی کمی نہ تھی، اِس لئے وہ اُس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ پھر یہ نوجوان وہاں سے چلا گیا، اور تھوڑی دیر میں واپس آیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے جیب میں سے کچھ چنے اور جَو وغیرہ نکال کر ڈالے۔ اِس دفعہ وہ کامیاب ہُوا، اور کچھ ہرن اس کی طرف آئے۔ یہاں تک تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکے اور عورتیں اور بڑے آدمی بھی، جنہیں حیوانات سے دلچسپی ہے اور اس بے زبان مخلوق سے ہمدردی رکھتے ہیں، باغ حیوانات میں آکر اُنہیں کچھ کھلاتے ہیں۔ تعجّب کی بات تو وہ تھی جسے اب میں بیان کرتا ہوں۔ ان ہرنوں میں چند غزال عرب بھی تھے۔ غزال عرب جیسا سب جانتے ہیں، ہرن کی جنس میں سب سے زیادہ حسین، متناسب الاعضا، اور ہلکے بدن کا ہوتا ہے۔ یہ جب اس کے پاس آیا تو نوجوان نے ایک وارفتگی سے اس کے مُنہ کو پکڑ کے اُس کی آنکھوں کو چُومنا شروع کر دیا۔

غزال ایسی محبّت کا عادی نہ تھا، اور وہ کوشش کر کے اپنے تئیں چُھڑا کے، ہوا میں چوکڑی بھرتا، اور اپنے خوبصورت پتلے کُھروں کے

نشان زمین پر لگاتا، بھاگ گیا اور دُور جا کے کھڑا ہو کے مُڑ مُڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

مَیں نے دیکھا کہ نوجوان کے چہرے پر محزونیت کے علائم زیادہ گہرے ہو گئے، اور اس نے جنگلے سے ٹیکا لگا کے عربی زبان میں یہ کہنا شروع کیا:۔

"معلوم ہُوا، بس نجد میں ہی نہیں (اور اس فقرے سے میں سمجھا وہ نجدی ہے) بلکہ ہر جگہ یہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ ما ادری میں ان کے بُرا چاہنے والوں میں تو ہوں نہیں واللہ، مگر (اور یہاں اُس نے ایک شعر پڑھا جس کا اگر سرسری ترجمہ کیا جائے تو یہ ہو سکتا ہے،

عبنا لیلیٰ کا سا چلن ہے دیکھو سارے غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

سوائے اس لڑکی کے کہ میں اُس کی توجہات اور عنایات کا ممنون ہُوں، باقی اور میں نے کسی لیلیٰ چشم کو اپنی طرف مائل، اپنے اوپر رحیم نہ پایا، اور مصیبت یہ ہے کہ میں ایک بے اختیارانہ، بیتابانہ

کشش سے ان کی طرف کھنچتا ہوں۔ آہ لیلیٰ میں تیری پرستش کہاں کہاں اور کس کس چیز کو دیکھ کر کرتا ہوں! تجھے کچھ خبر بھی ہے؟ مگر تجھے کیا خبر اور خبر ہونے کی ضرورت ہی کیا۔"

یہ کہہ کر اُس نے کوٹ کی جیب میں سے ایک رومال نکالا اور چہرے پر رکھ لیا، اور آہستہ آہستہ وہاں سے باہر چلا گیا اور میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس نظارہ سے کون متاثر نہ ہوتا۔ میں متاثر ہُوا مگر اس سے زیادہ متعجّب، یہ معاملہ کیا تھا، قصّہ کیا تھا؟ لیلیٰ انجد ایں سُن رہا تھا، یا واہمہ نے صورتیں اور مکالمہ پیدا کر دیا تھا؟ مگر میں صحیح عرض کرتا ہُوں کہ جب میں اُس باغ میں گیا ہوں، نہ میں نجد کا خیال کر رہا تھا، اور نہ لیلیٰ کا نام میرے ذہن میں تھا۔ اس حیرت انگیز واقعہ کی توجیہ کرنے سے میں تو قاصر ہُوں آپ اور آپ کے معزّز اخبار کے بیشمار ناظرین کی خدمت میں اس غرض سے پیش کرتا ہوں کہ اس کے متعلق اپنی رائے سے بذریعہ روزنامہ اخبار کے مطلع فرمائیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سیکڑوں برس کے بعد اُس سرزمین میں جس کا نام ہی ہم مشرقیوں کے دلوں میں، دوزِ زندۂ جاوید

عاشق و معشوق کی یاد تازہ کر دیتا ہے، کیا یہ ممکن ہے۔ میں ڈر ڈر کے کہتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے اس خیال پر لوگ میری ہنسی اُڑائیں گے۔ میں کہتا ہوں کیا یہ ممکن ہے کہ اُس سرزمین میں جو اُس عجیب و غریب ڈرامے کی تماشاگاہ رہی ہے، پھر وہ ایکٹر آ کھڑے ہوئے ہوں؟ راقم متحیرؔ و متعجبؔ۔ (انتخاب از روزانہ اخبار)

۲۰ اپریل ۱۹۰۰ء کا "متحیر و متعجب" شاید اس کی توجیہ نہ کر سکے مگر ہمارے ناظرین کو کسی قسم کی توجیہ کی ضرورت نہیں، وہ تمام واقعات سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ صرف اتنا کہنا ہے کہ قیس دو دن ہوئے دلّی سے اپنے وطن جانے کے ارادے سے روانہ ہو چکا تھا، دو ایک دن کے لئے لاہور بھی ٹھہر گیا، اور یُوں ہی باغ حیوانات کی سیر کو چلا گیا تھا۔

باغ حیوانات سے متاثر و مخزوں، اپنی جائے قیام پر آیا تو اُسے ایک اور وائرلیس ملا، جو دہلی ہوتا ہُوا یہاں آیا تھا:-

"اس عرصہ میں میری طبیعت پھر اچھّی نہیں رہی، نقاہت بہت ہو گئی تھی، کل شب کو کوئی آٹھ یا نو بجے ڈاکٹروں نے میرے

ہاتھوں کو (ELECTRIC BATTRY) (برقی بیٹری) لگائی
اُس وقت تو ہاتھوں میں بہت اینٹھن ہوئی اور تکلیف پہنچی۔ مگر
اب حالت بہت بہتر ہے۔ لیلیٰ"

ناظرین نے حساب لگا لیا ہوگا، یہ وہ رات تھی اور وہ وقت
تھا جبکہ دہلی میں قیس، سوفا پر سے گر پڑا تھا۔ اور اس کے ہاتھ
اینٹھنے لگے تھے۔

ڈاکٹروں نے اُس وقت مرگی تشخیص کی تھی، معلوم ہُوا علم طب،
اُس وقت ہمارے زمانے سے بھی بہت زیادہ ترقّی کر گیا تھا!

(۶)

ریل کا اسٹیشن تھا، اُس شہر کا جو اس خصوصیّت کے لحاظ
سے دُنیا میں یگانہ ہے، کہ یہاں ملّت واحد رہتی ہے، اور خدائے واحد
کی پرستش کرتی ہے، جہاں انسان خدا کو خدا مانتا ہے، اور
اُس کے پُرعظمت، پُرہیبت خیال کو سامنے رکھ کر خیال کو، خیال
کے سوا کسی اور چیز کو نہیں!۔ اس کے مقابل میں اپنے عاجز سر کو
جُھکاتا ہے، جہاں تک پہنچنے، جسے ایک دفعہ دیکھنے کی آرزو دُنیا

کی آبادی کے ایک بڑے حصّہ کو ہے، جس کے قریب پہنچ کے امارت واسارت، حاجت و نعمت، علمیت و جہالت، اپنے ظاہری لباسوں اپنے بیرونی رختہائے پُرالوان کو علیحدہ کرکے، ایک سفید، ایک بے داغ گویا اپنے تمنّائے دلی (یعنی کاش اُس کی طرح ہم بھی بے لوث و بے داغ ہوتے) کو ظاہر کرنے والے لباس میں ملبس ہوکر، عقیدت کے ولولے اور جوش کے غلغلے کے ساتھ آگے بڑھتی ہے، جہاں میں نہیں کہتا کہ گناہ نہیں ہوتا، مگر جہاں ارتکاب گناہ کی نیّت سے لوگ نہیں جاتے۔ جس کی طرف خدا کو، اپنے تئیں سونپنے والا، دُنیا کے کسی حصّہ میں ہو، احتراماً منہ کرتا ہے، جہاں موحدین کا قبلہ، مسلمین کا کعبہ ہے، جو مکّہ ہے۔ سکتہ الحدید الحجاز کے اس موقف پر قطار آکر ٹھہری مدیر الموقف، جلدی سے اپنے ادارہ سے نکل کر انتظام و نگرانی کے لئے باہر آکھڑا ہُوا۔ قطار کی گاڑیوں کی کھڑکیاں کھُلنی شروع ہوئیں۔ اور اُن میں سے، عقیدت و اخلاص کے جوش میں متوالی، اپنی منزل مقصود تک پہنچ جانے کی خوشی میں سراسیمہ، دُنیا کے ہر حصّہ اور ہر زبان کے بولنے والی خلقت نکلنے لگی۔

اس خلقت کے ہجوم میں ہمارا قیس اور اس کا باپ بھی تھا!

ہندوستان سے واپسی پر قیس کی حالت میں کوئی بہتری ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں کو توقع تھی، اور اس توقع میں اس کا بیچارہ درماندہ حیران پریشان باپ بھی شریک تھا کہ ہندوستان سے واپس آنے پر وہ (قیس) لیلیٰ کا اس قدر گرویدہ نہ رہے گا۔ سفر اور غیر ممالک کے مناظر اس کو نئی دلبستگیاں دکھائیں گے۔ نئی دلچسپیاں سوجھائیں گے، اور وہ لیلیٰ کے نام کی اِس قدر رٹ نہ لگائے گا، (قیس کے حصول مرام کی جہاں تک اس کے شفیق باپ سے ہو سکتا تھا، اُس نے کوشش کی تھی، مگر لیلیٰ کا غرور دولت اور عالی خاندانی کے نشہ میں سرشار خاندان ان کوششوں کو نہایت حقارت سے رد کر چکا تھا)

اُس کا باپ سمجھتا تھا کہ وہ اس قدر گرویدہ نہ رہیگا، مگر ہُوا کیا؟ جس وقت وہ واپس آیا تو ایک ایسے انسان کی طرح جو بہت دنوں تک بھُوکا رکھا گیا ہو، اور پھر اس کے سامنے عمدہ کھانا پیش کیا جائے، نتائج کی طرف سے بے پروائی کے ساتھ اُس نے لیلےٰ سے ملنے

کی کوشش کرنی شروع کی۔

جب اُس کے خطوط پے در پے وہاں سے واپس آنے لگے، تو اس نے "العصر" قیسیمؔ میں جو نجد کا سب سے بڑا اخبار تھا لیلیٰ کے لئے خطوط چھپوانے شروع کر دیئے۔ وہ اپنی بیتابی اور بے صبری کو نہایت پُر درد الفاظ میں ظاہر کرتا تھا:۔

"ل کو ابھی اس میں اتنی عقل تھی کہ لیلیٰ کا نام درج نہیں کرتا تھا۔ تمہارے قدموں تک میری جبیں کا پہنچنا کجا، تمہارے حضور تک میرے فریاد نامے بھی نہیں پہنچتے، نہیں پہنچنے دیئے جاتے۔ تمہارے جو دو ایک وائرلیس مجھے ملے ہیں، اُنہوں نے مجھے اس کی ہمت دلائی ہے کہ میں تم سے تمہاری توجہات کی مداومت و ابقا کی التجا کروں۔ مگر عرصے سے وہ بھی بند ہیں۔ کیا ایک مُلک، ایک شہر میں رہ کر میں خیریت مزاج کی خوشخبری سے بھی محروم رہوں گا؟ آہ نجد میں رحم نہیں رہا، نجد میں شاید ہو، مگر تمہارے خاندان میں نہیں۔ ق"

کچھ یہ ہی ہوتا آیا ہے کہ محبت میں لوگ سمجھتے ہیں کہ باقی دُنیا کی

سلہ نجد کا سب سے بڑا شہر۔

آنکھیں نہیں، اور کوئی اُن کے راز کو نہیں جانتا، اُن کی کیفیّت کو نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ وہ یہ سمجھا تھا کہ کوئی اس اشتہار کے رسوائے لیلیٰ کے معنی نہ سمجھے گا، نہ کسی کو یہ پتا چلے گا کہ کس کی طرف ہے اور کس کے لئے ہے۔

مگر ان اشتہاروں نے، اس کی اور اس کے ساتھ لیلیٰ کے خاندان کی خوب شہرت کی، وہ ظاہر ہے کہ ان کو پڑھ پڑھ کے آگ بگولا ہو گئے۔ اور انہوں نے "العصر" پر ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش دائر کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ لیکن لوگوں نے بیچ میں پڑ کر مصالحت کرا دی ایڈیٹر نے نہایت لجاجت سے معذرت خواہی کی، اور اس بات کا یقین دلایا کہ آیندہ سے اس قسم کے اشتہار کسی صورت میں نہ چھپیں گے۔

یہ حالتیں دیکھ کر اس کا والد حیران تھا اور اُسے کوئی ترکیب نظر نہ آتی تھی لیلیٰ کا خاندان اپنی طرف اڑا ہوا اُدھر قیس کی یہ کیفیّت بیچارہ اپنے تئیں ایک بڑی مصیبت میں مبتلا پاتا تھا۔ آخر اُس نے مذہب کی طرف رجوع کی، اور اس اُمید پر کہ وہاں پہنچ کر قیس رو براہ ہو گا، اور وہاں اُس کے صلاح مزاج کی دُعا قبول ہو گی، وہ اپنے ر دُنیا کی

نظر میں دیوانے) بیٹے کو لے کر مکّہ آیا۔

وہاں آیا، جہاں ہر شخص اپنی عزیز ترین تمنّا لے کر آتا ہے، جس در کے سامنے، جس چھت کے نیچے، سب سے زیادہ صمیمی، سب سے زیادہ دلی دُعائیں مانگی جاتی ہیں، یا زیادہ صحیح یہ کہ ہر جگہ سے زیادہ قوّی اُمیدِ اجابت کے ساتھ تخت سماوی کی طرف جاتی ہیں (ورنہ صمیمیت تو دُنیا کے ہر گوشہ میں فریاد قلب کر رہی ہے) وہاں وہ اُسے لے کر پہنچا۔ خود خضوع وخشوع سے دُعا مانگی اور قیس سے بھی کہا کہ اپنی قابل رحم حالت سے نجات پانے کے لئے دستِ دُعا اُٹھائے۔

اور قیس نے دست دُعا اُٹھائے، اور انتہائے صمیمیت، نہایت تضرع سے، اعماق دل سے نکلنے والی صدا سے، دعا مانگی، مگر کیا؟ وہی جو اُس نے سیکڑوں برس پہلے مانگی تھی، اور جو ہر قیس طبیعت چاہے وہ کہیں ہو اور کسی زمانے میں ہو، مانگے گا:۔

"میں جس مصیبت میں مبتلا ہوں، خدا کرے وہ کبھی کم نہ ہو"

دوست کا خط

تو پیارے دوست کا پیارا خط ہے! تجھ میں وہ کونسی برقی شے بھری ہے جو میرے دل کو دھڑکاتی ہے! تجھے کھولتے وقت ہاتھ کیوں کانپنے لگتے ہیں؟ آخر تجھ میں اور کاغذوں سے کیا برتری ہے؟ تو بھی کاغذ کا ٹکڑا وہ بھی کاغذ کے ٹکڑے، بلکہ وہ تجھ سے زیادہ بڑے ہیں۔ ہاں باعث تفاخر و تفوق یہی ہے ناکہ دوست نے تجھے لکھا، لب پان خوردہ سے اُف، لب پان خوردہ سے لفافہ بند کیا؟ بیشک، یہ بہت بڑا تفوق ہے۔ اچھا مَیں تیرا امتحان لیتا ہوں، تجھے نمبر دیتا ہوں، تو میں دیکھوں تجھے کتنے نمبر ملتے ہیں۔

اُن کے ہاتھوں سے چھوئے جانے کے ——— ۴۰

اس بات کے کہ دستۂ کاغذ میں سے تجھے ہی منتخب کیا ——— ۵۰

اُن لبوں نے لفافہ کو بند کیا ——— ۷۰

۱۶۰

ہیں! تو نے سَو سے زیادہ نمبر پائے۔ نہیں یہ امتحان ٹھیک نہیں ہوا دوسرے طریقے سے شمار ہونا چاہئے۔

اس بات کے کہ تجھے میرے لئے منتخب کیا۔ اور کسی دوسرے کے لئے نہیں منتخب کیا ——————— ۶۰

اس بات کے کہ اُن کے قلم کی تحریر تجھ پر ہے ——— ۴۰

اس بات کے کہ اُن کے چہرے کا عکس تجھ پر پڑا کیوں کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ خطرات کو لکھا ہے ——————— ۵۰۰ ۶۰۰

کیا؟ پھر سَو سے زیادہ ہو گئے! یہ ٹھیک نہیں، اچھا تیسری بار پھر امتحان:۔

اس بات کے کہ تو اُن کے مژدۂ صحت و خوشنودی مزاج کی خبر لایا ——————— ۸۰

اِس بات کے کہ تجھے چاک کر دیئے جانے کا حکم ہے ۱۰۰۰۰

یہ کیا؟ نمبر تو سَو سے پھر بڑھ گئے۔

نہیں نہیں! میں بے فائدہ کوشش نہیں کرنے کا، تو امتحان سے بالا، موازنہ سے اعلیٰ، قید مقابلہ و مقائسہ سے آزاد، پیارے

دوست کا پیارا پیارا، ہائے میں کیسے ظاہر کروں کتنا پیارا خط
جسے تو سینہ سے لگایا جائے گا۔ تو نظرِ اغیار سے بچایا جائے گا،
مگر (حاشا) تو چاک نہیں کیا جائے گا۔ تو میرے پاس محفوظ رہے گا،
اور میں ہزاروں مرتبہ تجھے تنہا گوشوں میں پڑھوں گا ٭

اگر میں صحرا نشیں ہوتا

اگر میں صحرا نشیں ہوتا، تو طلوع و غروبِ آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہوتا۔ چاندنی رات کو میں دیکھتا کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں، اندھیری رات میں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دل میں عمیق حسیات محسوس کرتا۔ میں کسی وادی میں گڈریہ ہوتا، پُرفضا گھاٹی کے پھول۔ اور ان پھولوں کو دیکھ کر رنگین اور لطیف گانے گانے والی بُلبُل، ہلکی آواز سے گرنے والے آبشار مجھے گھنٹوں حیرت زدہ رکھتے اور میں پُرمسرّت زندگی بسر کرتا۔

مگر شہر نشین ہوں اور کیا دیکھتا ہوں؟ ایک غریب مزدور کا لڑکا سڑک سے گزر رہا ہے، ایک عالی شان محل کے سامنے (جس میں عیش و تنعم و گناہ کے سوا کچھ نہیں) کھڑا ہو جاتا ہے؟ کھڑکیوں کو کھڑا گِن رہا ہے اور یُوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ آگے چل کے ایک بڑی پُررونق حلوائی کی دُکان کے سامنے کھڑا، حسرت سے مُنہ اور آنکھیں کھولے، دیکھ رہا ہے مٹھائیوں کو دیکھ دیکھ کے اُس کے مُنہ میں پانی بھر بھر آتا ہے، لیکن وہ خرید نہیں سکتا۔

ایک بے والی، وارث لڑکی کو دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اس کا تبسم معصوم، ایک بوسۂ ناجائز پر (جس کے ساتھ اس کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ پیسے دیئے جائیں گے) قربان ہو جائے گا۔

پھر ایک شرابی سامنے سے گزرتا ہے جس کی قوتِ معنویہ سب محو ہو چکی ہے، جو جان جان کر زہر پی رہا ہے۔

پھر ایک چور پر نظر پڑتی ہے جسے فلاکت و حاجت کے کوڑے نے چوری پر مجبور کیا، اور جسے اوروں کو عبرت دلانے اور اُسے آئندہ چوری سے باز رکھنے کے لئے زندان کو لئے جا رہے ہیں! گویا فلاکت د

حاجت زنداں سے ڈرتی ہے!

ایک متعفّن اور گھنی بیماری میں مبتلا فقیر کو دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ ایک فٹن، بھڑک دار فٹن میں بیٹھا ہُوا امیر اُدھر سے گزرتا ہے اور اس فقیر کو دیکھ کر تنفّر سے مُنہ پھیر لیتا ہے۔

آہ شہر نشین ہوں، روتا ہوں اور کہتا ہوں:۔

اے مایُوس دلو! اے مدفنِ سرور مزار و! تمہارا خیال مجھے رلاتا ہے، تمہیں سوچتا ہوں اور تم پر دل کُڑھاتا ہوں۔ جیسا میرا مایُوس دل ہے ایسے کتنے ہو چکے ہیں، اور کتنے اس وقت ہیں! شاید پہلے اتنے دل خُون نہ ہوتے ہونگے، مگر اب کیا؟ اب تو مجھے ہر جگہ سینہ چاکی، دل شکستگی نظر آتی ہے۔

دھڑک دھڑک، اے قلب یاس بنیاد! اپنے لئے، اپنے جیسے لاکھوں مصیبت زدہ دلوں کے لئے دھڑک، ٹکڑے ٹکڑے ہو جا، بہا، جا دُور ہو جا، تیرا وجود میرے لئے بار گراں ہے، تو مزار ہے۔

سیلِ زمانہ

بہے جا، بہائے لئے جا۔ نہ تجھ میں سلامتی، نہ تیرے کنارے سلامتی۔ مٹے ہوؤں کے نشان مٹائے جا، تیرا کون کو ڈبا، غواصوں کو نہ اُبھار، یہی تیرا کام ہے۔

تجھ میں جو خوشنما ہرے بھرے جزیرے نظر آتے ہیں، جو پھولوں اور پھلوں سے مالا مال ہیں، جن میں خوبصورت پرند چہچہا رہے ہیں، کیا یہی لذائذ حیات ہیں؟ وہ حسین سحر کار عورتیں، جو ہاتھ میں ستار لئے دل رُبا گانے گا رہی ہیں اور جادو بھری نظریں ڈال ڈال کر مجھے اپنی طرف بلا رہی ہیں، کیا یہی جوانی کی اُمنگیں ہیں؟ آہ! مجھے اس جزیرے کو دیکھنے دے، ان دیولوں سے، ان پریوں سے

تو بلند شعلوں کے گانے سے اپنے دل کو راحت تو پہنچانے دے، مگر تو کس کی سنتا ہے، تو نے کسی اور تنکے کی کشتی سے جو تیری ... تھا اچھال لیے، تجھے بھی قسم ہے بہائے لے جائے گا، اچھا، ذرا ٹھہر مگر یہ تو بتا دے، تو مجھے کہاں سے لا رہا ہے، کب سے لا رہا ہے کیوں لا رہا ہے، کب تک بہائے گا؟ ....

یہ کیا، کیا اور تیزی سے بہنا، بھنور میں پڑنا، طوفان کا اٹھنا، موجوں کا مجھے تھپیڑے مارنا، میرے سوالوں کا جواب ہے؟ تجھے میرے سوالوں سے غصہ آ گیا؟ میں نے بے ادبی کی؟ اچھا، اچھا جواب نہ دے، بہتے جا، بہائے جا۔

میری روح تجسس بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہے نینوا، بابل، قدیم ہند، قدیم مصر کے کھنڈر مجھے نظر آتے ہیں۔ واعظ کہتا ہے: "باطل، باطل، سب باطل ہے"

سکندر، ہنیبال، نوشیرواں، دارا، تیری موجوں سے کبھی کبھی ان آوازوں سے ملتی جلتی آوازیں آتی ہیں۔ کیا شہرت رفتگاں بھی ہے؟ فلاسفر کہتا ہے: "دھوکا، دھوکا، سب دھوکا ہے، شہرت

دھوکا ہے، نام و نمود دھوکا ہے، خود زندگی دھوکا ہے"

لیکن نہیں، میں نہ ملل سابقہ کو باطل، نہ شہرت رفتگاں کو دھوکا سمجھتا ہوں۔ اُن کی شہرت ہمت بڑھاتی ہے، لیکن یہ خیال کرکے کہ کیا ہوں میں اور کیا ہے میری ہست و بود، دل بیٹھ جاتا ہے۔

اِس لئے بہتر یہی ہے کہ لاتعداد خس و خاشاک کی طرح جو مجھ سے پہلے آئے اور بعد میں آئیں گے بہے جاؤں:۔

پس اے سیلِ زمانہ، بہے جا، بہائے لئے جا، اور اس بحرِ ناپیداکنار میں اُس عمان عظیم الشان میں، اس اوقیانوس ابد میں اب یا جب تیرا دل چاہے گرا دے ✣

سودائے سنگیں

فرامرز مرزبان جمشید جی سے، بمبئی کے قلابہ اسٹیشن پر اتفاقاً ملاقات ہوئی اور اس ملاقات نے مجھے بہت حیرت میں ڈالا۔ سال بھر سے میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ اس عرصہ میں، اس میں کس قدر تغیر ہو گیا تھا! اُس وقت، اس کے ہلکے چہرے کے اُداس رنگ پر، مسرتِ شباب کا غازۂ گلگوں بھرا ہُوا تھا، آج ایک انجماد عنبر میں ایک سانولے پن کے ساتھ ساتھ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کی ہلکی سرخی مائل مونچھوں میں جنہیں اُسوقت وہ کاسمیٹک لگا لگا کے فوجی ڈھنگ پر سیدھی اور نوک دار بنایا کرتا تھا اور جن سے اُس کے چہرے کی ایک زنانہ ملاحت پر ایک مردانہ وقار پیدا ہو جاتا تھا،

آج ایک پریشانی تھی، اور اضطراب کی تکلیف دہ کیفیت کے ساتھ کھلے ہوئے ہونٹوں پر ایک تھکن برس رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نوجوان پر بھی جو ہمیشہ بنے سنورے رہنے کے لئے مشہور تھا، زندگی کی کسالت غم چھاگئی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھے دیکھ کے خوش ہوگا۔ برخلاف اس کے میں نے دیکھا کہ اس اتفاقیہ ملاقات سے جس میں اُسے مجھ سے بات کرنی پڑے گی وہ بیزار معلوم ہوتا تھا۔ ذرا سا ہٹ کے ہمیرے بیٹھنے کے لئے اُس نے بنچ پر جگہ دی اس لئے کہ قواعد اخلاق کی مخالفت صریح نہ ہو، اس کے پتلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پیدا ہوئی مگر پیدا ہوتے ہی مرگئی۔

یہ پُراجتناب طرز قبول ایسی نہ تھی کہ مجھے اس بات کی ہمّت دلاتی کہ میں اپنی پُرانی عادت کے موافق "تم" سے اُسے خطاب کرتا، اس لئے میں نے کہا:-

"کہئیے ہوئیں" آپ سے" ملاقات ہی نہیں ہوتی"

"ہاں" کہا اور یہ کہہ کے اپنی بائیں کہنی کو بنچ کے ہتھے پر ٹیک کے بیٹھ گیا؛ نگاہ فرش کے پتھروں پر گاڑ دی اور سگرٹ

کی راکھ گرانے کے لئے سگریٹ پر اپنی انگلی آہستہ آہستہ مارنے لگا۔
نگاہ تو اس کام پر مگر خیال کہیں اور، اس حالت میں اُس نے
اپنا فقرہ جاری رکھا:۔

"ہاں، پچھلے سال اُس واقعہ کے بعد، میں والدہ کے ساتھ بمبئی
آیا تھا، اُس وقت سے اب تک بند ورہ میں ہی ہوں، کبھی یہاں آتے
ہی نہیں، آج کا آنا مستثنیٰ سمجھنا۔
کس واقعہ کا مجھ سے ذکر کر رہا تھا؟
ٹوٹے ٹوٹے فقرے کہتا تھا، آنکھیں سگریٹ سے نہ ہٹاتا تھا۔
پھر گویا اس بات سے متعجب ہو کر کہ ایک ہی دفعہ اس قدر باتیں کر گیا
وہ یکایک اپنے فقرے کو تمام کئے بغیر رک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ یہ نوجوان جس کی تمام گزشتہ زندگی مجھے معلوم تھی، یاس کی
ہولے گراں سے بیتاب ہے۔

یہ نوجوان جو ہمیشہ متبسم و ظریف رہتا تھا یہاں تک کہ اپنے
آلام عاشقانہ میں بھی کوئی ایسی حکایت ضرور کہتا جو تمہیں خوش
کرتی، اپنی سب سے زیادہ یاس انگیز حسیات و کیفیات کی رقیق اور

پُرتاثیر زبان سے تصویر کھینچتے ہوئے، یہ دیکھ کر کہ اُس کی سرگزشت تمہارے دل میں رقّت پیدا کرنے کو ہے، ایک نہایت ہی چھوٹا سا لطیفہ اپنی سرگزشت میں غیر معلوم طریقے سے داخل کر کے تمہارے مُنہ سے ضرور ہی قہقہہ نکال لیتا، غرضیکہ یہ ہمیشہ لطیف و شوخ ہمیشہ ہنسنے ہنسانے کے بہانے ڈھونڈھنے والا نوجوان، اس وقت کے اُکھڑے اُکھڑے رنجیدہ خیالات میں مستغرق نوجوان سے اس قدر دُور نظر آتا تھا کہ میں خود حیرت میں تھا..........

فرامرز کو میں برسوں سے جانتا تھا، یہ ایک شاعر تھا، حسنؔ و فکرؔ شاعر اگرچہ لسانؔ نہ ہو۔ اپنی تمام ہئیتِ معنویہ کے ساتھ شاعر تھا کہ زندگی کو نورِ شعر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ اُن بدبختوں میں سے تھا جو زندگی کی مادیات کے تھپیڑوں کے کھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں حالانکہ اُن کا خستہ و مجروح اور ہائے ستم! شاعرانہ دل مثل ایک مریض بچے کے اُن تھپیڑوں کے کھانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مگر اُس کی طبیعت میں ایک میلان نشو تھا کہ سب سے زیادہ مکدّر زمانے میں اپنے پُرملال چہرے پر اک مسکراہٹ ضرور رکھتا

تھا۔ اس تبسّم سے میں یہ سمجھتا تھا کہ اُسے زندگی کی مادیات سے جب پالا پڑتا ہے تو اُن کے یقین نہ کرنے میں ثابت قدم رہنا چاہتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دھوکا دیتا ہے۔ خود کہا بھی یہی کرتا تھا :۔

"زندگی میں سے موسیقی اور شعر، پھول اور روشنی، پھر ان سب کا مجموعہ، ان سب کا ماحصل عورت کو نکال ڈالو، پھر دیکھیں، کیونکر دُنیا میں زندہ رہنے کی قوت اپنے میں پاتے ہو؟"

اگر زندگی انہیں چیزوں سے عبارت ہوتی اور اُن کی حقیقت بھی صرف تخیل سے مترکب ہوتی تو ہم سب کتنے خوش قسمت ہوتے مگر یہ رنگین چیزیں ہوا ہیں اور رنگ، کہ اُڑ جاتی ہیں، غائب ہو جاتی ہیں اور یہ عورتیں؟ کتاب حیات کی اس جلد کو ایک جلد زر اندود کی شکل میں دُور ہی سے دیکھتا تھا۔ اُسے پڑھنے، اُس کے بابوں اور صفحوں کو جو آنسوؤں سے لکھے گئے ہیں ابھی دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ابھی اُسے یہ حقیقت معلوم نہیں ہوئی تھی کہ زندگی میں شعر، ایک نوحۂ ماتم، موسیقی، اک فغان یاس، پھول ایک منجمد قطرۂ گریہ، روشنی، اک امید گریزاں کے علاوہ اور کچھ نہیں اور

ابھی اُس نے یہ نہیں معلوم کیا تھا کہ عورت بھی اُس سراب کی مانند ہے کہ ڈھونڈو مگر نہیں ملتا، دکھائی دیتا معلوم ہوتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا۔

پہلے اُس سے ہفتہ میں اک دفعہ تو ضرور ملاقات ہُوا کرتی تھی۔ ملاقات کا زمانہ گزرے ہوئے زمانے کی تلافی کر دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ اس ملاقات میں، اپنی زندگی کے۔ اپنی عاشقانہ زندگی کے، وہ کوئی دوسری زندگی سے واقف ہی نہ تھا۔ تمام صفحوں کو مجھے دکھاتا، سات آٹھ فقروں میں اس ملاقات اور پچھلی ملاقات کے درمیان کے زمانہ کی تاریخ سُنا دیتا۔ کبھی ایک لفظ ہی ایک ہفتے کی رپورٹ سُنانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی مجھے دیکھ کر اُس کا خوش خوش مُسکرانا یا مُنہ بنانا کُل حال بتا دیتا تھا۔

یہ راز کہنا اور سُننا، کس طرح اور خاص کر کس لئے شروع ہُوا تھا؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مجھے اپنا رازدار بنانے کی عادت کی ابتدا

اُس نے اس طرح کی تھی۔

ایک دن صبح۔ آج کی قلابہ اسٹیشن کی ملاقات سے پانچ سال قبل۔ اپالو بندر پر میں نے اُسے دیکھا۔ اپالو بندر پر صبح کے وقت اُس کا ہونا، اس وقت کی زندگی کے لحاظ سے ذرا عجیب شے تھی مجھے دیکھتے ہی مجھے اُس کی وجہ بتائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دن اس کی طبیعت میں باتیں کرنے کا بہت جوش تھا، اور چونکہ ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جس سے وہ دل بھر کے باتیں کر سکتا تھا، اس لئے وہ خوش معلوم ہوتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا: "بھائی کیا اچھا ہوا تم مل گئے، تم سے مشورہ کروں گا۔ مجھے ایک شادی کے لئے ایک ہدیہ تیار کرنے کی ضرورت ہے (کہتے وقت ہنسنے اور اپنے تئیں بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا) ہمارے عزیزوں میں سے ایک لڑکی بیاہی جانے والی ہے۔ اس کے مناسب ایک ہدیہ تیار کرنے کے لئے میں نے کس قدر اپنی طبیعت پر زور ڈالا، اور انتخاب کرنے تک کن مشکلوں کا سامنا ہوا۔ پہلے میں نے چاہا کہ کوئی جڑاؤ زیور دو، مثلاً ایک فیروزہ یا عقیق کی انگوٹھی یا ایک ننھی سی سونے کی

سینے پر لگائی جانے والی گھڑی۔ مگر میں نے اس خیال کو چھوڑ دیا۔ کیوں کہ ان چیزوں کے دینے میں کوئی نزاکتِ طبع ظاہر نہیں ہوتی ان چیزوں کے دینے کے یہ معنی ہوتے کہ میں اُس کے مذاق پر تحکمانہ اثر ڈالنا چاہتا ہوں "ایسی انگوٹھی پہنو، ویسی گھڑی لگاؤ" کے قبیل سے اس پر ایک دباؤ ڈالنا ہُوا جس کے علاوہ اس میں ایک خواہش نمایش بھی ملی ہوتی، گویا میں (میری چیز وہ ایک ہی بات ہے) اُس کی انگلیوں میں اس کے سینے پر نظر آؤں۔ سچ پوچھو تو اس میں ایک گنوارپن کا پہلو بھی تو نکلتا ہے۔ ہے نا؟ یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک تحفہ دینا جس کی قیمت بھی اُس پر کھدی ہو۔ یہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتے ہیں، دیکھنے والے آنکتے ہیں "اس انگوٹھی کی لاگت پچاس روپیہ کی ہو گی، یہ گھڑی ڈیڑھ سو کی ہو گی"۔

یہ فرامرز جمشید جی، جو اُس دن اپولو بندر میں کھڑا، کبھی اس پاؤں پر زور دے کے، کبھی اُس پاؤں پر، اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہایت وضاحت سے بیان کر رہا تھا اور فلسفہ بدایا پر لکچر دے رہا تھا، پانچ سال بعد اُس بڈھے نوجوان سے کتنا

الگ کس قدر دُور نظر آتا تھا جو سر نیچا کئے، رنجیدہ شکل میں سگرٹ کی راکھ گرا رہا تھا اور مجھ سے آنکھیں نہ ملانی چاہتا تھا۔

غرضیکہ اُس دن فلسفہ ہدایا پر لکچر دیتے ہوئے کہ رہا تھا:۔

"میں نے پھر ایک اور چیز سوچی، انگریزی اور ہندوستانی مٹھائیوں کا اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی جو مل سکیں، تاج محل ہوٹل کی مٹھائیاں، فوانڈانٹ وغیرہ کا ایک خوان بھیجوں۔ مگر اُن کی صرف ایک دو دن کی زندگی ہوتی ہیں چاہتا تھا کہ ...."

فرامرز کی اصلی تمنّا میں ان تمام باتوں سے سمجھ رہا تھا۔ اس کا بلا لزوم مجھے اس قدر سمجھانا، ایک شادی کے تحفے کے لئے اس قدر تفصیلات بیان کرنا، ان باتوں میں جو وہ بیان کر رہا تھا، وہ مطالب جو وہ بیان نہیں کر رہا تھا صاف جھلک رہے تھے۔

کہنے لگا: "آخرکار انتخاب کر ہی لیا، آؤ دکھاؤں" یہ کہتا ہُوا مجھے گھسیٹ کر مارکس اینڈ کمپنی جوہریوں کے ہاں لے گیا۔ وہاں ایک کمرے میں لے جا کر بیچنے والے سے پوچھنے لگا: "سنگاردان تیار ہو گیا؟"

سنگاردان تیار ہوچکا تھا۔ وہ لایا گیا۔ یہ چاندی کا (جس پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا)، ایک جڑاؤ سنگاردان تھا، جو ایسی نزاکت و نفاست سے بنایا گیا تھا کہ بنانے والے نے اپنی حسن طبیعت کو ایک ایک خط میں صرف کیا تھا۔ ڈھکنے پر چاندی کے مجسم پھول اور پھل۔ مثلاً سیب اور نارنگی کے پھل اور گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے، ان میں جابجا موتی ٹکے ہوئے تھے، اندر کے خانے، لونڈر اور عطروں کی شیشوں اور قیمتی صابونوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر ایک چاندی کی کشتی تھی جس میں مخمل بچھی ہوئی تھی۔

کہنے لگا: "میں نے اس کو بنوایا۔ اس میں عطر ہونگے، عطر میں بسے ہوئے رومال ہونگے۔ سنگار کی چیزیں ہونگی۔ خوشبوئیں ہونگی، اُبٹنے ہونگے، پوڈر ہونگے، وہ چیزیں ہونگی جو اُس کے مشام خیال میں برسوں تک کسی وقت کی بہار زندگی کی خوشبوئیں پہنچائیں گی ....."

غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں بھول گیا تھا، اور مجھے اپنا رازدار سمجھ کے باتیں کہہ رہا تھا۔ یہاں تک مجھے کہ یہ سمجھانے

لگا کہ اس تحفے کو کیوں انتخاب کیا، وہ باتیں جو اس کے قلب میں بھری پڑی تھیں، کسی کو سُنا کے خالی کرنا چاہتا تھا۔ شاید اُس دن میں نہ ہوتا اُسے کوئی دوسرا ملتا، اُسی سے یہ سب باتیں کہتا:

"سمجھتے ہو؟ اس تحفے کے مطلب، اس ہدیہ کے ماخذ، اس کی رُوح کو پورے طور پر محسوس کرتے ہو؟ اس طرح میں اس کے کپڑوں تک میں حلول کر جاؤں گا، یہ چیزیں اُس تک ایک بوئے امل پہنچائیں گی اس کے خواب نوشیں میں بھی میری کوئی چیز ہوگی، میں اس کے نہانے کے پانی تک میں نفوذ کر جاؤں گا، اُبٹنا مل کے، جب اپنی ہتھیلیوں میں چُلّو بھر بھر کے پانی لے گی، تو اس کی پتلی اُنگلیوں کے بیچ میں سے آبشار مسرّت بن بن کے، اُسے ایک لطیف اور معطر ٹھنڈک کی بہار دوں گا۔ اور جب وہ نہا کے تولیہ سے بدن ملے گی تو اس کے مُنہ، اُس کی گردن اُس کے کندھوں سے گویا میری رُوح کا ایک نفس خیال ایک غبار صاف و سفید بن کر، ایک معطّر بوسۂ پرّاں کی طرح اُڑے گا۔ اُس کے بعد اپنے رومال کو وہ لونڈر کے دو قطروں سے ملے گی، اور جب وہ اُسے سونگھے گی تو گویا میں اس کی

سنگاردان تیار ہو چکا تھا۔ وہ لایا گیا۔ یہ چاندی کا (جس پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا، ایک جڑاؤ سنگاردان تھا، جو ایسی نزاکت و نفاست سے بنایا گیا تھا کہ بنانے والے نے اپنی حسن طبیعت کو ایک ایک خط میں صرف کیا تھا۔ ڈھکنے پر چاندی کے مجسم پھول اور پھل۔ مثلاً سیب اور نارنگی کے پھل اور گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے، ان میں جا بجا موتی ٹکے ہوئے تھے، اندر کے خانے، لونڈر اور عطروں کی شیشوں اور قیمتی صابونوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر ایک چاندی کی کشتی تھی جس میں مخمل بچھی ہوئی تھی۔

کہنے لگا: "میں نے اس کو بنوایا۔ اس میں عطر ہونگے، عطر میں بسے ہوئے رومال ہونگے۔ سنگار کی چیزیں ہونگی۔ خوشبوئیں ہونگی، اُبٹنے ہونگے، پوڈر ہونگے، وہ چیزیں ہونگی جو اُس کے مشام خیال میں برسوں تک کسی وقت کی بہار زندگی کی خوشبوئیں پہنچائیں گی . . . . "

غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں بھول گیا تھا، اور مجھے اپنا رازدار سمجھ کے باتیں کر رہا تھا۔ یہاں تک مجھے کہ یہ سمجھانے

لگا کہ اس تحفے کو کیوں انتخاب کیا، وہ باتیں جو اس کے قلب میں بھری پڑی تھیں، کسی کو سُنا کے خالی کرنا چاہتا تھا۔ شاید اُس دن میں نہ ہوتا اُسے کوئی دوسرا ملتا، اُسی سے یہ سب باتیں کہتا:

"سمجھتے ہو؟ اس تحفے کے مطلب، اس ہدیہ کے ماخذ، اس کی رُوح کو پورے طور پر محسوس کرتے ہو؟ اس طرح میں اس کے کپڑوں تک میں حلول کر جاؤں گا، یہ چیزیں اُس تک ایک بڑے اہل پہنچائینگی اس کے خواب نوشیں میں بھی میری کوئی چیز ہو گی، میں اس کے نہانے کے پانی تک میں نفوذ کر جاؤں گا، اُبٹنا مل کے، جب اپنی ہتھیلیوں میں چُلّو بھر بھر کے پانی لے گی، تو اس کی پتلی اُنگلیوں کے بیچ میں سے آبشار مسرّت بن بن کے، اُسے ایک لطیف اور معطّر ٹھنڈک کی بہار دوں گا۔ اور جب وہ نہا کے تولیہ سے بدن ملے گی تو اس کے مُنہ، اُس کی گردن اُس کے کندھوں سے گویا میری رُوح کا ایک نفس خیال ایک غبار صاف و سفید بن کر، ایک معطّر بوسۂ پرّاں کی طرح اُڑے گا۔ اُس کے بعد اپنے رومال کو وہ لونڈر کے دو قطروں سے ملے گی، اور جب وہ اُسے سونگھے گی تو گویا میں اس کی

تمام اعماق رُوح میں پہنچ جاؤں گا ۔ ۔ ۔ ،

یہاں تک پہنچ کے اُس نے یکایک یہ معلوم کیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ کہہ گیا اور وہاں تک بڑھ گیا کہ اب واپس ہونا ممکن نہیں، یہ دیکھ کے اُس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور تمام اضطراب قلب کو ایک چھوٹی سی آہ میں قید کر کے کہنے لگا: "آہ! اس قصّے کو میں کسی اور وقت سُناؤں گا۔"

غرضیکہ فرامرز نے مجھ سے اپنے فسانۂ دل کا کہنا اس طرح شروع کیا تھا، اوّل اوّل ہماری ملاقات محض ادبیات کے جلسے ہوا کرتے تھے وہ بھی فارسی ادبیات کا عاشق، الفنسٹن کالج سے فارسی میں آنرز کا گریجوایٹ، میں بھی فارسی ادبیات کا دلدادہ، وہ قاآنی کے قصیدے اور پروفیسر مرزا حیرت اور حافظ کی غزلیں سُناتا سُناتا، افسانۂ دل سُنانے لگا۔ اُس دن کے بعد ہر ملاقات میں اس فسانہ دل کے باب بڑھنے لگے، یہاں تک کہ میں اس کی تمام سرگذشت حیات سے واقف ہوگیا۔ گویا اُس کی عاشقانہ ایسی زندگی تھی کہ میں بھی اُس میں شریک تھا اور ہم دونوں مل کے اُس زندگی

کو بسر کر رہے تھے، اُس وقت میں نے یہ قطعی رائے اپنے دل میں قرار دے رکھی تھی کہ فرامرز کا یہ عشق، اوّل اور آخری عشق ہوگا، لیکن وہ اُسے قبول نہ کرنا چاہتا تھا، اگر اس کے ادعا پر اعتبار کیا جاتا تو یہ عشق محض ایک بچپن تھا، ایک لڑکپن کا کھیل کہ معلوم نہیں کب سے شروع ہُوا، مگر شروع ہو کے جاری رہا۔ اس کے متعلّق جو اُسے باتیں یاد تھیں ہنس ہنس کے (گویا انہیں اہمیت نہ دینی چاہتا تھا) بیان کرتا اور بیان کرتے وقت اس لڑکپن پر تعجّب کرتا نظر آتا تھا، لیکن نہ معلوم کیوں، ایک تاثیر عمیق، اس ہنسی، اس خندۂ استہزا کے پردے کو چیر کے۔ نوجوان آدمی کے دل میں ایک غیر قابل شفا زخم کو ظاہر کرتی تھی جو اس عشق سے پڑ گیا تھا۔ یہ دکھانے کے لئے کہ یہ عشق کیا تھا، مذاق تھا، وہ کہتا: میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس تمام دورۂ عشق میں، بیاہ کرنا، یا سادہ عشق و محبّت کی حد سے آگے بڑھنا، یا بڑھنے کی جرأت کرنا، ہم دونوں کے خیال میں بھی نہیں آتا، ہم بس سادہ ایک دوسرے کو چاہنا، یا یہ خیال کرنا چاہتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے عاشق ہیں گویا ہم دونوں نے ایک وقت مقررہ کے لئے حسن و

عشق کا ایک مضحک ناٹک کھیلنے کا ارادہ کیا تھا، اور ہم دونوں ایکٹر تھے۔ پردہ گرتا، تماشا ختم ہوتا، اور ہم دونوں ایک دوسرے سے نہایت خوشی سے ہاتھ ملاتے، اور ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرتے کہ خوب پارٹ کیا۔ اور اس تماشے کو جسے ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا، وہیں چھوڑ کے، ہر ایک اُس راستے پر پڑ لیتا جو ہمارا اطلاعِ معیشت ہمارے لئے ہمیں بتاتا۔ ہم دونوں اُسے جانتے تھے اور اُس کے متعلق گفتگو کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اپنی شادی کے متعلق اپنے تصورات مجھ سے بیان کیا کرتی، جن گھرانوں سے اُس کے لئے پیغام آتے اُن کے متعلق مجھ سے رائے پوچھتی، یہاں تک کہ ایک دن ماں بیٹی کا ایک جوڑا اُس کے گھر آنے والا تھا اور یہ معلوم تھا کہ دونوں ماں بیٹی اُسے انتخاب کرنے کی نیّت سے آ رہی ہیں؛ اُس دن میں نے ہی اُسے بتایا کہ کیا کپڑے پہننے چاہئیں اور کیا سنگار کرنا چاہئے۔ ازدواج حقیقتِ زندگی سے اس قدر متعلق ایک چیز تھی کہ اُس کا سوچنا بھی ممکن نہ تھا۔ میں تو اُس مناسبت یا اگر آپ اُسے اس لفظ سے یاد کرنا چاہیں تو، اس عشق کے

جہت شعری کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس کی زندگی کو ایک خواب ابدی محبّت میں رکھ کے، اپنی زندگی بھی اسی مدہوشی میں گزارنا چاہتا تھا۔ بس اس قدر اور کچھ نہیں"۔ پھر گویا ان تمام حجتوں کی تائید کے لئے اس کے لبوں پر ایک ایسا تبسّم اور اُس کی آنکھوں میں ایک ایسی نگاہِ رجا ہوتی تھی جو مجھ سے بھی ایک صدقہ تصدیق مانگتی نظر آتی تھی کہ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کٹھ حجتوں سے خود اُس کا دل بھی مطمئن نہیں ہُوا اگر میں ایک لفظ بھی ایسا کہہ دیتا جس سے شبہ ہوتا کہ میں ان حجتوں پر یقین نہیں کرتا، یا ذرا سا بھی خیال ایسا ظاہر کرتا کہ میں اُسے اُس کی غفلت حیات سے جنہیں وہ کوشش کرکے بڑھانا چاہتا تھا ہٹانا چاہتا ہوں، تو میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ ایک دم سارا اعتراف کرلیتا، رو پڑتا اور کہتا کہ میں اُس کے عشق میں مر رہا ہوں لیکن اگر میں ایسا کرتا تو حقیقت میں گویا میں اُس کی موت لاتا۔ وہ اپنے دل کو دھوکا دینا چاہتا تھا، اور مجھے بھی لازم تھا کہ میں اس معاملہ میں اس کی تائید کروں، ورنہ اُس کے دل پر حقیقت ظاہر کرنے کی چوٹ لگانا یعنی یہ کہنا کہ در اصل تم اُسے از دل و جان چاہتے ہو،

گناہ تھا۔ مجھے یہی لازم تھا کہ میں اُس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنے زخم دل کو ڈھانپنا اور اُس سے نگاہ ہٹانا چاہتا تھا، اس کی مدد کروں اور اس طرح اس کی سلامتی کی خدمت کروں۔

لیکن کبھی کبھی وہ مجھ سے کھل جاتا اور ایک دوسرے لہجہ میں کہتا: "کہیں تمہیں خبر ہو کہ ان تمام حرکتوں سے جو لڑکپن سے زیادہ کچھ نہیں تھیں کبھی کبھی مجھ میں اک عجیب تاثیر حسرت پیدا ہوتی ہے۔ ہاں میں اس کا اعتراف کرتا ہوں، کبھی کبھی ایک ایسی حسرت پیدا ہوتی ہے کہ میں رونے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ جب کہ یہ لڑکپن ہنسی کھیل سے آگے کے درجے کی کوئی چیز نہیں، جب کہ اگر اس پر غور کیا جائے تو اس کی قیمت ایک قہقہ سے زیادہ نہیں جب یہ حالت ہے تو یہ حسرت کیوں؟ سوچا تو خود ہی اس کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی: ہمارا یہ کھیل ہمیشہ رہنا چاہیئے تھا اُسے تا ابد ایک لڑکی رہنا چاہیئے تھا اور مجھے تا ابد نوجوان لڑکا رہنا چاہیئے یہ حالت بڑھنے والی، کبھی نہ گھٹنے والے برسوں کی نامتناہی مدت کے ساتھ قائم رہنا، جاری رہنا چاہیئے تھی۔ یہ خواب بغیر اس کے کہ حقیقت کا

ضربہ اس پر لگے، یہ افق گریزاں بغیر اس کے کہ حد پر پہنچے یوں ہی دراز ہوتے رہنا چاہیئے تھا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ ضرور ایک نہ ایک وقت آتا کہ ضربۂ حقیقت اِس شگوفۂ خیال پر پڑ کر اسے بکھیر دیتا۔ آخر وہ وقت آیا۔ اس کے مقابلے کے لئے ہم کیا کر سکتے تھے؟ بیاہ؟ اس کا نتیجہ عینی یہی نہ تھا؟ کیونکہ بیاہ کے بعد یہ خواب بالکل ملیامیٹ ہو جاتا؟ مگر نہیں ملیامیٹ نہیں ہُوا۔ ہمیں اُس زندگی کے شعر کو یاد رکھنا مقصود تھا۔ سو وہ شعر اب بھی شعر بکر و تازہ ہے، اس کی یاد زندہ رہے گی اور زندہ ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کا خیال کر کے، مگر زیادہ روحانی، زیادہ روحانی مناسبت کے ساتھ (یہاں تک کہ اب اس کے متعلق باتیں بھی نہیں ہوتیں) زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گویا دُور سے یاد ایام کے ساتھ ایک خاموش عاشقی معشوقی لیکن ......" لیکن کے بعد فقرے کو پورا نہیں کرتا، پھر اس تقریر کو جسے میں کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا ایک لمبے اور ٹھنڈے سانس سے، جس میں بڑی کوشش سے وہ ایک قہقہہ بھی شامل کر سکا ختم کر کے کہنے لگا: "کیا معلوم تم میری ان بے تکی باتوں پر دل میں کس قدر ہنستے ہو گے اور میری حقارت کرتے

ہو گے، اور اجی سچ پوچھو تو ساری اصل وحقیقت، سارا لطف شعر یہاں ہے" یہ کہہ کے اپنے چہرے پر شوخی اور شرارت کا رنگ لا کے، مثلاً سامنے چوپاٹی پر سمندر کے کنارے بنچ پر کوئی حسین پارسن بیٹھی ہوتی، اُس کی ریشمی ساڑھی کو سمندر کی ہوا ہٹا کے، اُس کی گوری گردن اور ہلکے کپڑے میں چھپے ہوئے سینے کی جھلک دکھاتی کنکھیوں سے اُس کی طرف اشارہ کرتا۔

میں اپنے دل میں کہتا: "بدقسمت بیمار، غیر قابل شفا بیماری میں بیمار"، لیکن کچھ دنوں بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُسے اپنی بیماری کا علاج مل گیا تھا، اب ایک نشوۂ بے قید کے ساتھ اُن لوگوں کی طرح جو زندگی میں مزہ ہی کرنا چاہتے ہیں، اُس نے اپنے تئیں اندھادھند عیش میں ڈال دیا، ایک جاڑے کا موسم متواتر گرانٹ روڈ کے تھیٹروں ہی میں گزارا۔ مجھ سے کہتا: دن سو سو کے گزارنا بھی کیا مزے کی چیز ہے۔ انسان چونکہ سورج کو نہیں دیکھتا، اس لئے اُسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ رات کی زندگی۔ گویا کرۂ مہتاب میں جاکر زندگی بسر کرتی سی معلوم ہوتی ہے

چاہو تجربہ کر کے دیکھ لو۔"

اسی عرصہ میں اس نے الفرڈ تھیٹر کی اکٹرسوں میں سے ایک سے دوستی پیدا کر لی، اور ایک دن اس کے ایک واقعہ کو ایک مبہم واقعہ کے طور پر مجھ سے بیان کرنے لگا۔ اس کی کسی عورت سے دوستی ہوتی مجھ سے چھپانے کی ضرورت نہ سمجھتا تھا۔ اس ایکٹرس کے متعلق ایک دن مجھ سے کہنے لگا: "گوہر جان، کس قدر بھولی لڑکی ہے ہرگز خیال میں نہیں آسکتا کہ کس طرح یہ بھولی بھالی لڑکی، اسٹیج پر آکر شیطانی مسکراہٹ سے مٹک مٹک کے، چمک چمک کے سینہ کو اُبھار اُبھار کے، تمام تماشا دیکھنے والی خلقت کی حریص نظروں کے سامنے عشوہ فروشی کرتی ہے، ایسی بچپن کی سی باتیں کرتی ہے، کہ دل بے اختیار قربان ہونے کو چاہتا ہے۔ کمپنی کے ساتھ ہندوستان کے سارے شہروں میں پھر آئی ہے، لیکن یہ خیال کرتی ہے کہ یہ سارے شہر ایک خط مستقیم میں گویا ایک تار کے اوپر سلسلہ بسلسلہ بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگی: "بمبئی کے بعد کون سا شہر آتا ہے۔ اوّل میں نے اس سوال کو سمجھا نہیں: لیکن اُس نے خود ہی ایک کے بعد

ایک دیا سلائی رکھ کے مجھے سمجھانا اور گننا شروع کیا: بمبئی کے بعد دلّی، دلّی سے لکھنؤ، پھر بنارس، پھر امرتسر، پھر لاہور، پھر حیدر آباد، پھر کلکتہ آتا ہے، اور اس بات سے جھلاّ کے کہ میں اتنی دیر میں سمجھتا ہوں، مجھی سے پوچھنے لگی: "اس کے بعد؟" اس وقت میں بھی دیا سلائیاں رکھ کے گنانے لگا: مدراس، مدراس کے بعد پشاور، پھر بنگلور، پھر رنگون، پھر احمد آباد، پھر ٹمبکٹو، یہ آخری نام سُن کے، مارے خوشی کے اچھل پڑی۔ "ٹمبکٹو، ٹمبکٹو خوب نام ہے! وہاں ناٹک بھی ہوتا ہے کہ نہیں؟" اگر کہیں میں کہتا کہ ہاں ہوتا ہے تو وہ شاید وہاں تک جاتی، مگر کہیں دفع بھی ہو کیونکہ میری طبیعت اس لڑکی سے بھر گئی۔

فرامرز کی طبیعت ہر کسی سے بھر جاتی تھی۔ یہ لڑکی بمبئی سے چلی گئی شاید ٹمبکٹو کا ناٹک دیکھنے گئی ہو گی کہ میں نے سُنا کہ فرامرز نے کمبالاہل میں اک جرمن گورنس سے راہ و رسم پیدا کی ہے۔ اس زمانے میں مجھ سے اک دفعہ ملتے ہی اس گورنس کے متعلق اپنی رائے بیان کرنے لگا: "اُس قدر کھاتی ہے، اس قدر کھاتی ہے کہ نفرت ہو گئی اگر تم کہیں اُسے اپنے ہونٹوں اور دانتوں سے ادھ کچے بیف سٹیک کا

خُون پونچھتے دیکھو تو ..... اُف" حضرت کا عشق بہت سے بہت اک مہینہ رہتا تھا۔ اس ایک مہینہ میں نہایت بے پروا اور خوش خوش نظر آتا کہ یکایک پھر اس پر تھکن اور غمگینی چھا جاتی، مگر ہر وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک خیال، جو اس کے دل میں ایسا بیٹھ گیا ہے کہ ہٹائے نہیں ہٹتا، اُسی کا تعاقب کرتا پھرتا ہے۔ مگر وہ ہاتھ نہیں لگتا۔

اُس کے ان تمام کھیل تماشوں، ان تمام دل بستگیوں اور پھر ان تمام کسالتوں میں یہ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اس پہلے اس سچّے عشق کی جراحت کے لئے ایک غیر قابل حصول دوا تلاش کرتا پھرتا ہے ہر نئی دل بستگی ختم ہونے کے بعد کسی نہ کسی بہانے سے اُس پہلے عشق کی بحث چھیڑ دیتا۔

اک دن اتوار کا دن تھا، وہ گاڑی پر میرے ہاں آیا، اور باہر سے یہ کہلا کے بھیجا کہ "جلد کپڑے پہن آئیے، میں گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں" مجھے چوپاٹی پر لے جانا چاہتا تھا، یہ بھی اک وہ دن تھا، جب کہ اُس کے نت نئے تعلقوں میں سے ایک تعلق ختم ہوا تھا، آج کل وہ تھیٹر کی مخلوق اور وہیں کی سڑکوں میں چکر لگایا کرتا تھا۔ گرانٹ روڈ چھوٹے کے

چوپاٹی پر جانے کے ارادے پر میں نے تھوڑا سا مسرّت آمیز تعجب ظاہر کیا، وہ کہنے لگا: "ہاں میں وہاں کی تمام ناپاکوں اور ناپاکیوں سے بیزار ہو گیا۔ اب میں ایک ایسی صورت دیکھنے کے لئے محتاج ہوں کہ کچھ تو مجھے پاک کرے، ایک ایسی صورت جو مجسم آسمانی شعر ہو۔"

آج ایک پارسی تہوار تھا، سمندر کے کنارے شام کے قریب پارسنوں کا نظر فریب مجمع تھا، اُن کی رنگا رنگ کی ساڑھیاں جنہیں بنگالنیں، مرہٹنیں سب ہی پہنتی ہیں مگر جنہیں حسن طبیعت کے ساتھ پہننا صرف یہ ہی جانتی ہیں۔ ہوائیں لہرا رہی تھیں، لڑکیاں بال کھولے باندھے طرح طرح کی پھول دار ٹوپیاں پہنے سمندر کے کنارے گھومتے اور سیپیاں جمع کر رہی تھیں۔ آسمان پر قوس قزح نکلی ہوئی تھی جس کے کنارے سمندر سے آ کر ملتے معلوم ہوتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوس قزح کی اقلیم میں قوس قزح کی پریاں پھر رہی ہیں، اور قوس قزح کی ملکہ کا یہ حکم ہے کہ جسے رنگ کی لطافت سے لگاؤ نہ ہو وہ یہاں نہ آئے۔ مسلمان عورتیں یہاں نہ تھیں، وہ پھولوں کے درمیان سمندر کے کنارے، آبشاروں کے قریب، سبزے کے اوپر، موسیقی

سے بھری فضائیں کب ہوتی ہیں؟

ہم دونوں نے تھوڑی دیر خاموش دو ایک چکر لگائے وہ کبھی گہری نظریں ڈالتا، کبھی ایک طرف کو سر جھکاتا، گویا کسی خیال میں غرق تھا، یکایک کہنے لگا: ہاں یہ چہرہ بیشک ایک لاہوتی شعر ہے، بشرطیکہ اس چہرے کا بھولا پن، فرشتہ پن قائم رہے اور اس دوسری میں دیکھو، پلکیں کس بلا کی ہیں؛ تم نے کبھی خیال کیا ہے بعض اوقات ایک مبہم سیما نظر آتا ہے اور اک دم نظر سے غائب ہو جاتا ہے پھر دوسرا چہرہ نظر پڑتا ہے اُس کے نقش جم رہے ہوتے ہیں، اُس کی تصویر لوح دل پر کھنچتی ہوتی ہے، کہ یکایک ایک خیال موہوم کی طرح وہ بھی نظر سے دُور ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ یہ چہرے جو پورے نہیں دیکھے جاتے پورے دیکھے جانے سے میرا مطلب، دل بھر کے نہیں دیکھے جاتے، ان باصرہ فریب مناظر میں دماغ کے اندر ایک خواب کی سی کیفیت ملا کر گڑبڑ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ چہرے مل ملا کے، ایک کا تبسم، دوسری کی نظر، تیسری کی ادا، چوتھی کے بال ایک پُر لطف مجموعہ دماغ میں پیدا کر دیتے ہیں، پھر اس طرح سے بنا ہُوا مجموعہ...“

یہاں تک کہہ کے یکایک ٹھٹکا، اور ٹھٹک کے ایک سامنے سے گزرنے والی فٹن پر نظر ڈالی، ہاں بیچارہ تمام اس طرح سے بنے ہوئے مجموعوں کے ذریعہ سے اُسے ہی، اُس پہلے عشق ہی کی جستجو کرتا تھا۔ جانے میرے دل میں یہ خیال کیسے آیا، شاید اس اُمید پر کہ اُس بیماری کی جسے اس ملاقات میں اُس نے بصراحت ظاہر کیا تھا، یہ دوا ہوگی میں نے کہا: "تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" اُس نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی گویا اُس سے کوئی بڑی حیرت انگیز بات کہی گئی، پھر ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا: "دیکھو یہ خیال فوراً قابل عمل تو نہیں" میں نے اس ہنسی کے جواب کا کچھ جواب نہیں دیا، وہ تھوڑی دیر چُپ رہا اور سامنے سے گزرنے والی گاڑیوں پر نظر ڈالتا رہا، پھر یکایک میری طرف سر پھیر کے کہنے لگا: "لیکن بھائی جان! میں کس کے ساتھ شادی کروں؟"

میں اس عرصے میں اس بات کو بھول بھی گیا تھا، نہ معلوم دفعتاً اُس کا خیال اس بات کی طرف کس طرح گیا۔ میں فوراً جواب نہ دے سکا لیکن اس نے جواب کی حاجت ہی نہ چھوڑی، کہنے لگا: اور کس لئے

شادی کروں پیاہ شادی سے انسان ایک نہایت اچھی عورت، اور شاید نہایت خوبصورت بچے حاصل کر سکتا ہے۔ مگر اس کے سوا؟"

"اس کے سوا اور کیا چاہتے ہو۔ اس میں بھی ایک شعریت ہے، بلکہ اصلی شعر حیات اسی میں ہے۔ مگر اس کو محسوس کرنے کے لئے اس کا لطف اٹھانے کے لئے قلب کو بہت سی چیزوں سے خالی کرنا ضروری ہوگا"

وہ رُکا پھر اُس نے جواب میں کہا: میں اپنے دل کو خالی کرنا نہیں بلکہ مختلف چیزوں سے اس قدر بھرنا ٹھوسنا چاہتا ہوں کہ آخر تاب نہ لا کر پھٹ جائے،، پھر رُکا۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا، اور پھر گزرنے والی گاڑیوں پر نظر ڈالتا رہا، اس کے بعد ایک شدید حرکت کے ساتھ میری طرف مڑ کے، اُس نے اوّل دفعہ مجھ سے اعتراف کیا: "کبھی یہ خیال کرتا ہوں کہ اس وقت میں نے بڑی غلطی کی، شاید اگر اُس کے ساتھ شادی کر لیتا، تو ممکن ہے کہ اس اضطراب دل کو سکون ملتا۔ آہ تم کیا جانو کہ مجھے کبھی کبھی کیسا سخت اضطراب ہوتا ہے"

آخر اس بدبخت شخص نے جس کے مُنہ سے یہ اظہار حقیقت نکل آیا تھا،

پہلے آہستہ اس نے اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھ کو لے لیا، اور پھر گویا اپنے اضطراب کے درجۂ شدّت کو جتانے کے لئے اپنی پوری قوت سے میرے ہاتھ کو دبا ڈالا۔ اُس کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ کیوں ازدواج کا ذکر اُس سے کیا کیوں کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس ذکر سے میں نے اُس کے کیسے حساس نقطۂ قلب کو ٹھیس لگائی، گویا میں نے اپنی انگلی تلاش کر کے اُس کے زخم پر رکھ دی اور ایسی ٹھیس لگائی جس سے اُس کو جتنی تکلیف پہنچ سکتی تھی پہنچ گئی۔

غالباً یہ سیر آخری سیر تھی، اس کے بعد میں بمبئی سے چلا آیا، کہ قسمت نے اس مرتبہ پھر اس نوجوان کو میری راہ میں قلابہ اسٹیشن پر مگر کس قدر تبدیل شدہ حالت میں لا ڈالا۔

آخر جب اُس نے سگرٹ کی راکھ گرا کے سر اُٹھایا تو میں نے "آپ" کو علیحدہ رکھ کے پوچھا، اُس واقعہ کے بعد، بمبئی آنے کا ذکر تم نے کیا تھا، وہ کونسا واقعہ تھا؟

اس نے اس دفعہ گویا گہرائیوں میں سے عالم اسرار کے اعماق

میں سے نکلنے والی نظر سے مجھے ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔ اس نظر میں ایک ایسی غیر معمولی چیز تھی کہ اس نوجوان سے جسے میں برسوں سے جانتا اور جس سے محبّت کرتا تھا، میرے دل میں ایک لرزہ بارد پیدا ہوگیا۔ اس سیکنڈ میں اس شخص کے اور میرے درمیان اس کا سبب میں نہیں جانتا۔ ایک ہوائے بارد و منجمد مجھے آ کے لگی، اور مجھے ٹھٹھرانے لگی۔ وہ اپنی عجب نظر سے ٹکٹکی باندھے رہا اور میرے سوال کا جواب تو نہ دیا، بلکہ خود مجھ سے پوچھنے لگا: "آج شام کو کہیں تمہیں کچھ کام تو نہیں، کسی سے وعدہ تو نہیں؟"

میرے جواب نفی پر، اُس نے تھوڑا سا تردّد کیا، آخر کہنے لگا:

"تو آج شام میں تمہیں نہیں چھوڑنے کا، آج رات کھانا میرے ہی ساتھ کھانا" اور جب اُس نے یہ دیکھا کہ مجھے جواب موافق کے دینے میں تھوڑا سا تردد ہے، تو نہایت درجہ صمیمیت اور عاجزی کے آواز سے کہنے لگا: "میں التجا کرتا ہوں!"

آج کی شام، جو وقت فرامرز کے ہاں گزرا وہ میری زندگی کے مستثنےٰ گھنٹوں میں سے ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بند ورہ لے گیا

اور شام تک درختوں میں چُپ چاپ کبھی کسی منظر کی طرف اشارہ کر کے کبھی کسی معمولی سے مضمون کے متعلّق ایک آدھ بے ربط لفظ کہہ کے، مجھے اِدھر اُدھر ٹہلاتا رہا۔ میں بھی حقیقت یہ ہے کہ اس سکوت سے خوش تھا۔

آخر گھر لوٹ کے کہنے لگا: "بہت بھوک لگی ہے، کھانا کھانا چاہئے" میں اک غیر معلوم سبب سے گھبرایا ہوا تھا۔ ہم نے کھانا کھایا جیسے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد اپنے خاص کمرے میں لے گیا اور کہنے لگا:

"یہ میرا کمرہ ہے۔"

یہاں تاریکی تھی۔ داخل ہوتے وقت، کثیف تاریکی کی وجہ سے مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس وقت شاید اس تاریکی کے سبب سے مجھ پر اک ڈر طاری تھا کہ اُس پر میں غالب نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر مجھے دیا سلائی کی رگڑ کی آواز آئی۔ اُس روشنی میں جو یکایک میری آنکھوں میں آئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی لرزہ دار شکل مبہم ہاتھ بڑھا کے دیا سلائی سے موم بتّی جلا رہی ہے۔ بتّی سے ایک سُرخ غبار روشنی نکلنا شروع ہُوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بتّی اس

کمرے کی کثیف ظلمت کو زائل کرنے کے لئے اپنے میں کافی قوت نہیں پاتی، مگر اپنی پوری کوشش کے پورے حملے کر رہی ہے۔ اور اس وقت کچھ تاریک کچھ روشن حالت میں میں نے دنیا کا سب سے عجیب اک کمرہ دیکھا۔ ساری دیواروں پر سُرخ کاغذ لپٹا ہُوا تھا اور ایک غیر منتظم ہوس کے ساتھ، دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں چینی کی رکابیاں جڑی ہوئی تھیں، بریکٹوں پر کہیں تاج محل کی سنگ مرمر سے بنائی ہوئی نقل، کہیں سنگ مرمر کے یا پیتل کے بُت، کہیں پنکھے۔ غرضیکہ سیکڑوں طرح کی اور سیکڑوں رنگوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بکھری ہوئی تھیں: مثلاً ایک چینی کی رکابی تھی جس پر ایک تصویر منقش تھی: ایک گھنے درختوں کا جنگل ہے، اس میں ایک بارہ سنگھا ہے جس کے سینگ ایک درخت کی شاخ میں اُلجھ گئے ہیں اور وہ اُنہیں چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس رکابی کے پاس ہی ایک بریکٹ پر، ایک لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے سے مندر میں جس کے اوپر سیپیاں چپکی ہوئی تھیں، گنیش جی مہاراج کا بُت رکھا ہوا تھا۔ ایک اور تصویر تھی جس میں ایک وحشی صورت لڑکی

تھی جس کا آدھا دھڑ سیاہ زمین میں غائب تھا، اور بالوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ تصویر کے نیچے دو جاپانی پنکھوں کو کھول کے اور دیوار میں گاڑ کے ایک عظیم تیتری کی شکل بنائی گئی تھی۔ غرضیکہ ان دیواروں میں کوئی کونا کھدرا ایسا نہ تھا کہ اُس میں فرامرز کے فکر عجیب نے ایک ہوس مجنونانہ کے ساتھ اپنا آشیانہ نہ بنایا ہو۔ ان سب کے بعد ایک کونے میں لکھنے پڑھنے کی میز! اُس کے پاس ایک چھوٹی سی گول میز، اور ایک گھومنے والی کتابوں کی الماری۔ اُن کے اوپر مختلف گلاس، کاسے، البم، کاغذ، کتابیں تھیں۔ زمین پر قالین کے اوپر بھی چھوٹی بڑی کتابیں کھلی اور بند پڑی ہوئی تھیں۔ پاس ہی ایک چیتے کی کھال بچھی ہوئی تھی اور اُس پر مختلف چیزیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ میز پر ایک گلدان میں ایک عجیب سُوکھا پودا لگا ہوا تھا۔ جس کے پتّے چھتری کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اس تمام گڑبڑ پر اگر سو دفعہ نظر ڈالی جائے تو ہر دفعہ ایک نئی چیز نظر آئے، چھوٹی چھوٹی لاتعداد چیزیں تھیں جن کے وہاں ہونے کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا تھا، اور پھر ان سب عجیب چیزوں کو ایک

لرزش حیات دینے والی موم بتّی تھی، جس میں سے مختصر سی سرخی مائل روشنی نکل رہی تھی۔

میں ایک آرام کرسی میں بیٹھ گیا، وہ میرے مقابل مگر کچھ فاصلہ پر کھڑکی کے پاس ایک چوکی پر بیٹھا، اور بلا کسی تمہید کے یکایک، چار گھنٹے اوّل کی گفتگو پر پلٹ کے خشک آواز سے کہنے لگا: "اس واقعہ کی تمہیں خبر نہیں؟ لو میں تمہیں بتاتا ہوں میرے ساتھ اُس نے بے وفائی کی۔"

میری زبان سے بے اختیار: "کس نے" نکلا۔

فرامرز نے فوراً جواب دیا: "اس نے۔"

اس وقت میں اُسے دُور سے، اس مختصر روشنی میں جس کے ساتھ کھڑکی سے داخل ہو کر اب چاند کی روشنی بھی شامل ہو گئی تھی، ایک خیال، ایک شکل مبہم کی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس روشنی میں وہ زیادہ ضعیف، زیادہ زرد نظر آتا تھا۔ اور اس کی اسرار انگیز آنکھوں میں، جو مجھ پر گویا برف باری کر رہی تھیں اور زیادہ وحشت معلوم ہوتی تھی۔ مجھ پر اپنی باتوں کا اثر معلوم کرنے کے لئے نظر

ڈال رہا تھا۔ یکایک اپنی جگہ سے اُٹھا، اور میرے سامنے آیا۔ میں پہلے ہی ہمدردی کے ساتھ سُن رہا تھا۔ کہ اُس نے بھرّائی ہوئی آواز سے کہنا شروع کیا:۔

"میں سچ کہتا ہوں بس اس کی توقع نہ رکھتا تھا۔ اس شام کو جب کہ آخری دفعہ ہم تم دونوں چوپاٹی پر تھے، وہ بھی وہاں تھی۔ اور سچ کہوں؟ میں اُسے ہی دیکھنے وہاں گیا تھا۔ کیونکہ ایک دن خواہ مخواہ میرے دل میں ایک شبہ پیدا ہو گیا تھا:۔ اگر کہیں بے وفائی کرتی ہو تو؟ میں نے ہر چیز کا تحمّل کیا تھا، لیکن یہ خیال کہ وہ اُس پاکیزہ عشق کی یاد میں صادق نہیں ہے اور میرے علاوہ کسی اور کو دل میں رکھتی ہے، مجھے مارے ڈالتا تھا۔ اُس نے بیاہ کیا، یہ اُس کا حق تھا۔ ہے نا؟ مگر اُس عشق کی یاد سے بے وفائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتی تھی۔ اُس دن میں نے اُسے ہنستے دیکھا، ایک نوجوان کے ساتھ ہنس رہی تھی یعنی کہ میرے ساتھ بے وفائی کر رہی تھی اور مجھے یقین ہے کہ صرف مجھے مار ڈالنے کے لئے ایسا کر رہی تھی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ

اُس دن میں نے کیسی طاقت فرسا کوشش سے اپنی طبیعت کو اس بات سے روکا کہ دوڑ کے اُس کی گاڑی پہ چڑھ کے اُس کا مُنہ نوچ لُوں؟

یہ کہتے وقت کانپ رہا ہے، گویا اس بے وفائی کے وہم و خیال سے دست و گریباں ہونا چاہتا ہے۔

میں نے کہا: "لیکن صرف اُسے ہنستا دیکھنا کافی سند نہیں" خاص کر جب کہ تمہارا اور اُس کا بات چیت کا بھی تعلق نہیں رہا تھا علاوہ ازیں تم بھی۔۔۔" اُس نے میری بات پوری نہ ہونے دی، میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اور نرم آواز سے گویا مجھے اپنا ہم خیال بنانا چاہتا ہے کہنے لگا:

"نہیں نہیں، وہ میرے ساتھ بے وفائی کرتی ہے، یہ محقق ہے تم بھی اُسے یقین کرتے ہو، تم بھی اُس کی دہشتِ تاثیر، مجھے مار ڈالنے والی قوت سے واقف ہو۔"

واقف ہی سمجھنا چاہئے تھا۔ کیا بحث کرتا۔ لازم یہی تھا کہ اعتراض نہ کروں۔

کہنے لگا: "ابھی تم میری ہنسی اُڑانا چاہتے تھے، یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے بھی تو اُس کے ساتھ بے وفائی کی؟ ہے نا؟ مگر یقین مانو کہ وہ تمام عورتیں جن سے میں ملتا تھا، وہ دل بہلاوے تھے۔ وہ اس عذاب اور اضطراب کے گھٹانے کے لئے کھلونے تھے جو اُسے نہ بھُولنے کی وجہ سے میرے دل کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ میری زندگی میں اگر کھلونا کوئی چیز تھی، تو صرف وہ تھی میں اُسے ہمیشہ صاف و پاک، ہمیشہ پُر شعر و خیال دیکھنا، اور ایک پاکیزہ اُفق سے اُٹھے ہوئے سحاب پارہ میں دفن کرنا چاہتا تھا۔"

پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کے کہنے لگا:۔

"آہ یہ عورتیں! مجھے اُن کا کیسا تلخ تجربہ ہُوا ہے جانتے ہو یہ کیا ہیں؟ یہ پھُول ہیں جن کی دُور ہی سے سیر کرنی چاہئے، کیونکہ جو چیزیں ان میں ڈھونڈی جاتی ہیں، وہ اُن میں نہیں ہوتیں۔ عورت، ایک رنگ ہے کہ اُسے دیکھتے ہو تو تمہیں مست و مدہوش کرتا ہے مگر یہ رنگ اس لئے بنا ہے کہ صرف دُور سے دیکھا جائے اُسے چھُونا مت، کیونکہ چھوتے ہی اُڑ جائے گا اور ایک پژمُردہ

داغ کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔ یا عورت، ایک روشنی ہے نظر فریب و دل باز، ایک خندۂ ضیا ہے اُس کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا کیونکہ روشنی غائب ہو جائے گی اور خندۂ ضیا کے بدلے، تاریکی رہ جائے گی۔ اُف! عورت سے توقع ہوتی ہے قصیدہ کی، ملتا ہے مرثیہ، اُمید ہوتی ہے اُن ہاتھوں سے تھپک کی، دیتے ہیں زخم۔ غضب یہ کہ یہ زخم بالکل باریک خط سے ہوتے ہیں، فوراً اُبھر جاتے معلوم ہوتے ہیں، مگر جن ناخنوں سے یہ زخم بنتے ہیں، اس میں ایک قطرۂ زہر ہوتا ہے، وہ اُس زخم میں نفوذ کرتا ہے اور آہستہ آہستہ اُس آگ کی طرح جو کرۂ زمین کے پیٹ میں ہے اور وہاں دھاتوں کو پگھلا رہی ہے، یہ بھی تمہارے خون میں گھس جاتا ہے اور جہاں گھستا ہے، اُسے مسموم کرتا ہے، ہر قطرۂ خوں میں ایک قطرۂ مہلک اور بڑھاتا ہے، یہاں تک کہ تمہاری زندگی زہریلی ہو جاتی ہے تم ہنستے ہوتے ہو، تمہیں کچھ خبر نہیں ہوتی، وہ اپنے فرض تخریبیہ کو پورا کرتا ہوتا ہے۔ تم اس وہم میں ہو کہ تم زندگی بسر کر رہے ہو وہ تمہیں مار رہا ہوتا ہے۔ ثانیہ بثانیہ تمہاری زندگی میں سے ایک

ایک ذرّہ لے کر تمہیں برباد کرتا ہے، اُکھاڑتا ہے، جلاتا ہے۔"

اب اس کی آنکھوں میں ایک کیفیّت۔ کس لفظ سے تعبیر کروں؟ ایک جانکنی کی سی کیفیّت پیدا ہو رہی تھی اور گویا اُس سے ایک بحرِ جنوں کی سیاہ موجیں جوش مار رہی تھیں۔ میں اس کی باتوں میں زرا سا ہرج نہ کرنا چاہتا تھا، صاف تو یُوں ہے کہ اس غیر معمولی زمین میں اس غیر معمولی آدمی کے ساتھ بحث کرنے کی ہمّت نہ رکھتا تھا اور ان آنکھوں کے مقابلہ میں میرے دل میں کبھی ڈر، کبھی رحم پیدا ہوتا تھا، اور میں اپنے سگرٹ کے دھوئیں کی آڑ میں اُن آنکھوں سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا، صرف اُس کی باتیں سُننا چاہتا تھا۔ وہ یکایک کھڑا ہو گیا۔ اب اس کی طبیعت میں ایک ہیجان تھا کہنے لگا:

"تم سے ایک بات کہوں؟ صرف تم سے کہوں گا، کیوں کہ تم سے کسی قسم کا اندیشہ یا خوف نہیں ہے۔ اس وقت تک میرے نزدیک دنیا میں اگر ذی حیات کوئی چیز تھی تو صرف وہ تھی۔ اُس کے بعد وہ بھی مر گئی۔ میرے نزدیک بالکل مر گئی۔ اب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دیکھو میں تمہیں تبلاؤں" یہ کہہ کے اُس نے میرا بازو پکڑ لیا، پھر ذرا سا جھک کے، سامنے کمرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا: "دیکھتے ہو"

مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کس چیز کو دکھانا چاہتا تھا، میں نے پوچھا "کسے؟" وہ ہاں ہوں ہی سے اشارہ کرتا رہا۔ اور اس چیز کا نام لئے بغیر کہتا رہا: "اُسے"

آخر مجھے معلوم ہوا۔ جو چیز مجھے دکھائی جا رہی تھی وہ سنگ مرمر کا ایک بُت تھا۔ ایک عریاں لڑکی جو سنگ مرمر کے ایک کرہ پر ایک پاؤں سے کھڑی تھی، اور گویا اپنے تئیں سنبھالنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھوں کو اُٹھائے ہوئے تھی۔ بُت تراشی کا ایک لطیف نمونہ!

فرامرز میرا شانہ پکڑے رہا، اور گویا اس لئے کہ کوئی اور نہ سُن لے، آہستہ آہستہ کہنے کے لئے مجھ سے اور آ ملا اور مجھے سمجھانے لگا۔ کندھا پکڑے جانے کی تضیئق، میرے مُنہ پر اُس کے سانس کا لگنا، مجھے گھبرا رہے تھے، وہ سمجھا رہا تھا:۔

ایک رات تھی، آج کی سی اُجالی رات نہیں۔ برسات کی گھُپ اندھیری رات تھی۔ کتنا زمانہ ہُوا، مجھے یاد نہیں۔ اندھیری رات تھی میں اسی کمرے میں تھا اور بتّی نہیں جل رہی تھی۔ میں اس اندھیری رات میں بجلی کی سیر کر رہا تھا! مگر اُس کا خیال کر کر کے۔ تم نے تاروں پر کبھی بجلی کو بھی کوندتے دیکھا ہے۔ دیکھو اس کھڑکی سے وہ دکھائی دیتے ہیں۔ اُس رات یہ تار اور سیاہ معلوم ہوتے تھے ایک سیاہی طاری تھی کہ بجلی اُس سے جنگ کر رہی تھی اور غائب ہو ہو جاتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اہرمن اپنے لمبے ہاتھوں کے لمبے ناخن بڑھا بڑھا کے، گاڑ گاڑ کے سینہ ظلمت کو پھاڑ رہا ہے اور اس سے ایک لمحہ کے لئے ایک شلالۂ خون نکلتا ہے اور پھر سیاہی میں غائب ہو جاتا ہے۔ میں اس کی سیر کر رہا تھا، مگر خیال میں وہی تھی۔ یکایک مجھے کمرے میں ایک حرکت سُنائی دی، اور کوئی سانس لیتا ہوا معلوم ہوا۔ میں مارے ڈر کے کانپا اور پھر جم کے رہ گیا۔"

اب میرے کندھوں کو اور دبا رہا ہے اور گویا کہیں وہ نہ

سُن لے، مجھ سے اور آملا، اور ہاتھ سے اُسے دکھا کے آہستہ آہستہ کہنے لگا:۔

"یہ تھی، ہاں یہی، اس کرہ کو اپنے پاؤں تلے لڑھکاتی میرے پاس آئی، اور آتے وقت، اُس کی تاریکی میں لرزتی اور قد میں بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے بعد بجلی جو چمکی تو میں نے اُسے صاف اور واضح طور پر دیکھا۔ میرے پاس آئی" میرے کندھوں کو اور دبا رہا تھا، مجھ سے اور ملتا جاتا تھا۔" میرے پاس آئی اور اپنے عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ تاڑوں کی تاریکی پر اہرمن، اپنے چمکدار جنگلوں سے خون گرا رہا تھا، کہ ہم ایک لمحہ میں ایک بوسۂ محبّت کے ساتھ اک عمر بسر کر گئے۔ اب اس رات کے بعد، ہر رات تاریکی میں لرزتی لرزتی، اپنے کرہ کو لڑھکاتی لڑھکاتی اور آگے آتے وقت قد میں بڑھتی بڑھتی آتی ہے اور اپنی عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیتی ہے اور ایک لمحہ میں، اُس لمحہ میں جو ایک عمر کے طول کی برابر ہوتا ہے۔ مجھے وہ لطف زندگی دیتی ہے، جو کسی عورت میں نہیں، خاص کر اُس میں نہیں جس نے میرے ساتھ

بیوفائی کی۔ اور یہ میرے ساتھ بے وفائی نہیں کرنے کی۔"

اس تقریر کو ختم کرکے، فرامرز نے میرے کندھے چھوڑ دیئے۔ دو تین قدم پیچھے ہٹ کے کرسی پر بیٹھ گیا، کہنی گھٹنوں پر رکھ کے، سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں مجھے ایسا نظر آیا کہ رو رہا ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ ہائے بیچارے کا دماغ!

میں بمبئی سے چلا آیا، مگر فرامرز سے پھر ملنے کو دل چاہتا ہے، خبر نہیں اُس نے اپنے اُس "پرستیدہ سنگیں" سے بھی کہیں بیوفائی تو نہ دیکھی۔

تمت

جلال الدین خوارزم شاہ

یہ ترکی زبان کے سب سے زیادہ مشہور ادیب نامق کمال بے کے ایک عظیم الشان تاریخی ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ ڈرامے کا زمانہ وہ جہاں آشوب عہد ہے جب کہ چنگیز خاں ایک بلائے مبرم کی طرح دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کر رہا تھا۔ ایک غیور و باحمیت بادشاہ جلال الدین اسلام کیلئے اس فتنۂ محشر کے مقابلے میں سینہ سپر ہوتا ہے۔ ڈرامے کا ہر صفحہ، ہر سطر عشق اسلام محبت وطن و الفت ملت کے جذبات عالیہ سے لبریز ہے۔ طرز بیان کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ترکی ادب کی سحر طرازی کا بہترین نمونہ ہے کتاب چھپ گئی ہے۔ قیمت عہ ۱۲/

ملنے کا پتہ

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

تصانیف سید سجاد حیدر صاحب بی اے

خیالستان

(مختصر افسانوں اور مضامین کا مجموعہ)

مشہور اخبار زمیندار اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے:-

دارالاشاعت پنجاب نے اُردو پر بہت ہی بڑا احسان کیا ہے کہ ادیب جلیل سید سجاد حیدر صاحب کی مشہور و مستغنی عن التحسین کتاب خیالستان کا دوسرا ایڈیشن شاندار ساز و سامان کے ساتھ چھاپ دیا۔ ہمارا ذاتی عقیدہ ہے کہ اُردو زبان کی ادبیاتِ لطیفہ میں خیالستان سے بہتر کتاب نہیں۔" اس کتاب کا یہ چھٹا ایڈیشن ہے۔ قیمت - - - ۸؍

ثالث بالخیر

"یہ ایک ترکی فسانہ نگار احمد حکمت کے ناول کا ترجمہ ہے جو مُلک کے مشہور ادیب سید سجاد حیدر صاحب نے کیا ہے، ترکی فسانوں کی لطافت و نزاکت تمام دُنیا میں مشہور ہے۔ ترکوں نے ادب لطیف کو درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ یہ ناول اگرچہ چھوٹا ہے مگر جذبات کے لئے اپنے اندر بہت سامان رکھتا ہے (اقتباس از اخبار زمیندار) قیمت فی جلد ۸؍ (طبع ثانی)

زہرا

یہ بھی ایک ترکی ناول کا ترجمہ ہے اور ترکوں کی معاشرت کا ایک اچھا نمونہ ہے قیمت فی جلد ۱۲؍ (طبع ثانی)

حکایات و احتساسات یعنی خیالستان (حصہ دوم)

یہ اُن مختصر فسانوں اور مضامین کا مجموعہ ہے جو خیالستان کی اشاعت کے بعد مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس میں مشہور ترکی فسانہ نگار خالدہ خانم ادیب کے مضامین کے ترجمے خاص طور پر قابل دید ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)